سرائیکی ادب کی تاریخ

(۱۹۴۷ء تا حال)

ڈاکٹر الفت ملغانی

اکادمی ادبیات پاکستان

CamScanner

سرائیکی ادب کی تاریخ
(۱۹۴۷ء تا ۲۰۲۲ء)

ڈاکٹر حمید اُلفت ملغانی

اکادمی ادبیات پاکستان

سرائیکی ادب کی تاریخ
(۱۹۴۷ء تا ۲۰۲۲ء)

ڈاکٹر حمید اُلفت ملغانی

اکادمی ادبیات پاکستان

Mir Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

کتاب کے جملہ حقوق بحق اکادمی ادبیات پاکستان محفوظ ہیں

اس کتاب کے متن کا کوئی بھی حصہ سوائے حوالے کے کہیں نقل یا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔
خلاف ورزی پر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا استحقاق رکھتا ہے۔

نگران اعلیٰ	:	ڈاکٹر یوسف خشک
مدیر اعلیٰ	:	محمد عاصم بٹ
تحریر	:	ڈاکٹر الفت ملغانی
نگرانی	:	حفیظ خان
طباعت	:	اختر رضا سلیمی
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	نسٹ پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد: 300/- روپے
		غیر مجلد: 250/- روپے

ISBN:978-969-472-541-3

Saraiki Adab ki Taareekh

Written By
Dr. Hameed Ulfat Mulghani

Publisher
Pakistan Academy of Letters
Islamabad, Pakistan

Mir Zaheer Abass Rostmani

CamScanner

فہرست

Mir Zaheer Abass Rustmani
CamScanner

Mir Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

پیش نامہ

پاکستان کے پچھتر سالہ یوم آزادی کی مناسبت سے اکادمی ادبیات پاکستان نے ملکی زبانوں کے ادب کی تواریخ شائع کرنے کے منصوبے کا آغاز کیا ہے جس کے تحت گذشتہ 75 برسوں میں ان زبانوں کے ادب میں ہونے والی پیش رفت کا اجمالی خاکہ پیش کیا جائے گا۔ "سرائیکی ادب کی تاریخ" اسی اشاعتی منصوبے کی اہم کڑی ہے۔ اس سے پیشتر پشتو، ہندکو، بلوچی اور براہوی ادب کی تواریخ شائع ہو چکی ہیں جب کہ دیگر تواریخ زیر اشاعت ہیں۔

ڈاکٹر الفت صفانی نے بہت دقت نظری سے قیام پاکستان کے بعد سے اب تک سرائیکی ادب کی تاریخ کو دلچسپ پیرائے اور جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ اس دوران میں جو ادبی تحریکیں وجود میں آئیں، جو قابلِ ذکر کتابیں اور رسائل و جرائد شائع ہوئے، اور جن بڑے اہلِ قلم نے ظہور کیا، ان کا مختصر احوال بیان کیا ہے جو پچھتر سالہ سفر کی ایک تصویر ہمارے سامنے کھینچ دیتا ہے۔

سرائیکی زبان شیریں ترین پاکستانی زبانوں میں سے ایک مانی جاتی ہے اور اس میں ادب لکھے جانے کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اسی زبان میں خواجہ فرید نے صوفیانہ شاعری کی تاہم ہر دور میں اس زبان کے آسمان پر عمدہ لکھنے والوں کی ایک کہکشاں سجی رہی۔

امید کی جاسکتی ہے کہ اس منصوبے کے تحت شائع ہونے والی دیگر کتب کی طرح اس کتاب کو بھی قارئین کرام مفید پائیں گے۔

ڈاکٹر یوسف خشک، میریٹوریس پروفیسر
چیئرمین، اکادمی ادبیات پاکستان

پیش لفظ

سرائیکی زبان و ادب کی اشاعت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہر وہ صنف سخن شائع ہو چکی ہے جو کسی بھی پاکستانی زبان میں اہم سمجھی جاتی ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے سالانہ اشاعتی سلسلے "کتابیات پاکستانی ادب" ۱۹۹۰ء تا ۲۰۰۸ء کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس فہرست سازی کے ذریعے منظر عام پر آنے والی مطبوعات میں اردو اور انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ تمام پاکستانی زبانوں کا ادب بھی شامل رہا ہے۔ متذکرہ انیس برس کی فہارس سے واضح ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں سرائیکی کتب کی تعداد دیگر ہمسایہ پاکستانی زبانوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ رہی ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان نے جہاں "کتابیات پاکستانی ادب" کے ذریعے پاکستانی زبانوں کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کو ابتدائی مواد مہیا کیا وہاں ان زبانوں کے ادب کو فروغ دینے کے لیے مختلف زبانوں کی کتابیات کی اشاعت، پاکستانی ادب کے تراجم خصوصاً اولین ناول کے اردو تراجم، اشاعتی سلسلہ "پاکستانی ادب کے معمار" کے طور پر ان زبانوں کے معروف اہل قلم کی شخصیت اور فن کے بارے میں تحریر کرائی گئی کتب، منفرد جریدہ "پاکستانی ادبیات" کی اشاعت اور پاکستانی زبانوں میں شائع ہونے والی کتب کے حوالے سے دیے جانے والے سالانہ "اکادمی ایوارڈ" کی اہمیت مسلمہ ہے۔

پاکستان کو معرض وجود میں آئے ۷۵ برس کا عرصہ بیت چکا۔ اس ۷۵ سالہ تاریخ کے حوالے سے ملک کے مختلف اداروں میں مختلف پروگرام ترتیب دیے گئے۔ اس سلسلے میں اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے پاکستانی زبانوں میں تحریر کیے جانے والے ۷۵ سالوں کے ادب کی تاریخ کو محفوظ کرنے کا فیصلہ قابل تحسین ہے۔

"سرائیکی ادبیات کی تاریخ (۱۹۴۷ء تا ۲۰۲۲ء)" اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس کتاب میں پاکستانی سرائیکی ادب کی مختلف اصناف میں ہونے والی پیش رفت کا مختصراً جائزہ لیا گیا۔

سرائیکی ادب کی تاریخ جیسے اس منصوبے پر کام تفویض کرنے کے حوالے سے میں ڈاکٹر

CS CamScanner

یوسف خٹک، چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان کا شکر گزار ہوں جن کی علم دوستی اور ادب سے دلچسپی کی بنا
پر "سرائیکی ادب کی تاریخ" تکمیل کو پہنچی۔

میں اپنی اس کاوش کو ڈاکٹر قاضی عابد کے نام کرتا ہوں جو امسال مادری زبانوں کے عالمی
دن کے موقع پر علمی و ادبی حلقوں کو سوگوار کر کے داغ مفارقت دے گئے۔

آخر میں جناب محمد عاصم بٹ، ڈائریکٹر، مدیر اعلیٰ، اکادمی ادبیات پاکستان کا شکریہ ادا کرتا ہو
ں جو وقتاً فوقتاً فون کر کے اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کی یاد دہانی کراتے رہے۔

۱۹۔اپریل ۲۰۲۲ء ڈاکٹر حمید الفت ملغانی

CamScanner

پس منظری مطالعہ

CS CamScanner

تہذیبی پس منظر

دنیا کی قدیم تہذیبوں نے دریاؤں کے کنارے جنم لیا اور انہی وادیوں میں پروان چڑھیں۔ چنانچہ وادی نیل کی تہذیب، وادی دجلہ و فرات کی تہذیب اور جنوبی ایران کے دریائے قرون کی تہذیب کے ساتھ ساتھ وادی سندھ کی تہذیب بھی دریاؤں کے کنارے آباد ہونے والی تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے۔ کوہ ہندوکش سے اترنے والے آریاؤں نے وادی سندھ کو "سپت سندھو" یا "سپتا سندھو" کے نام سے پکارا کیوں کہ یہ خطہ سات دریاؤں یعنی سندھ، چناب، راوی، بیاس، ستلج اور گھاگھرا (سرسوتی) کے حوالے سے جانا جاتا تھا۔ (۱)

تہذیب کے مختلف ارتقائی ادوار آلات و اوزار کی مناسبت سے مقرر کیے جاتے رہے ہیں جن میں پتھر کے زمانے کی تہذیب، کانسی کے زمانے کی تہذیب اور لوہے کے زمانے کی تہذیب اپنے اپنے دور کی نشاندہی کرتی ہیں۔ (۲)

وادی سندھ کی تہذیب کے ابتدائی دور کی نشاندہی کرتے ہوئے میر حسان الحیدری لکھتے ہیں:

> "تقریباً ساڑھے تین ہزار قبل مسیح میں ایک قوم برصغیر پاکستان و ہند کے مغربی حصے میں وارد ہوئی۔ یہ قوم وادی سندھ میں آباد ہو گئی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے یہاں ایک ایسے تمدن کی بنا ڈالی جسے وادی سندھ کی تہذیب کہا جاتا ہے۔ بعض ماہرین ان لوگوں کو دراوڑی نسل سے منسوب کرتے ہیں مگر یہ ابھی تک متعین نہیں ہو سکا کہ وہ دراصل سامی النسل تھے یا کسی اور قدیم نسل سے تعلق رکھتے تھے۔" (۳)

تاریخ شاہد ہے کہ تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل مسیح وادی سندھ میں ایک ایسی تہذیب کی عملداری تھی جو مغربی ایشیا کے دوسرے علاقوں کی طرح متاخر حجری دور کی تہذیب تھی۔ جہاں تانبے اور کانسی کے ہتھیاروں، اوزاروں اور برتنوں کے ساتھ ساتھ پتھر کے ہتھیار، اوزار اور برتن بھی مستعمل تھے۔ شہری زندگی باقاعدہ نظم و نسق کے تابع تھی۔ شہر منصوبہ بندی کے تحت بسائے جاتے تھے جن میں

شاہراؤں اور گلیوں کی کشادگی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا شہر میں صفائی اور حفظان صحت کے اصولوں پر بھی پابندی سے عمل ہوتا تھا۔(۴)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وادی سندھ میں لوہے کی باقیات دریافت نہیں ہوئیں جس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ تہذیب عہد جدید سے قبل کے زمانہ سے متعلق ہے۔ لوہا مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک میں تقریباً قبل مسیح کے دو ہزار سالہ دور میں دریافت ہوا ہے جب کہ وادی سندھ کا تعلق قبل تاریخ کے اس دور سے ہے جب شہر تعمیر ہونے لگے تھے اور شہری زندگی کسی نہ کسی نظم وضبط کے تابع تھی۔ ہتھیاروں، اوزاروں اور برتنوں کے بنانے کے لیے تانبے اور کانسے کے ساتھ ساتھ پتھروں کا استعمال بھی جاری تھا(۵)۔ موئن جودڑو اور ہڑپہ سے چند ایسی مہریں دستیاب ہوئی ہیں جو سارگن (۲۳۰۰ ق م)، شاہ عکاد (وادی فرات) کے زمانے کی مہروں سے مماثلت رکھتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وادی سندھ کے لوگ وادی دجلہ فرات کے لوگوں سے سلسلہ مواصلات رکھتے تھے۔(۶)

وادی سندھ کی تہذیب کے انتہائی عروج یافتہ دور کو ماہرین نے ہڑپائی تہذیب (Harappan Civilization) کا علمی اصطلاحی نام دیا۔ اس وقت اس علاقے میں ہڑپہ، موئن جودڑو اور ملتان جیسے نہ جانے کتنے شہر اور قصبے آباد ہو کر ترقی کی منازل طے کر چکے تھے(۷)۔ ایک اندازے کے مطابق دو ہزار تین سو سال قبل مسیح میں وادی سندھ ایک عظیم حکومت کا گہوارہ تھی اور اس کے دو دارالحکومت تھے ایک ہڑپہ جو راوی کے مشرقی کنارے پر واقع تھا اور دوسرا موئن جودڑو جس کی عظمت کے آثار ضلع لاڑکانہ میں ڈوکری اسٹیشن سے کچھ دور دریائے سندھ کے کنارے دیکھے جا سکتے ہیں(۸)۔ ہڑپہ اور موئن جودڑو غالباً ایک مملکت کے دو ہم عصر پایہ تخت تھے۔ بادی النظر میں یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن ایسی مثالیں تاریخی دور میں اور بھی ملتی ہیں۔ پروفیسر پگٹ نے ان کی مثال دوسری صدی عیسوی کے کشان عہد کے دو ہم عصر پایہ تخت پشاور اور متھرا سے دی ہے۔ اسی طرح نویں صدی عیسوی میں عربوں کے زمانہ اقتدار میں شمالی حکومت کا پایہ تخت ملتان (ہڑپہ کے قریب) اور جنوبی حصہ کا پایہ تخت منصورہ (موئن جودڑو کے قریب) موجود تھے۔(۹)

ہڑپائی تمدن کے کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ موئن جودڑو اور ہڑپہ جیسے شہر بار بار اجڑتے اور آباد ہوتے رہے۔ جب کہ ملتان اور اوچ کی آبادیاں قدیم بستیوں کے آثار پر آباد ہیں۔ ملتان اور مضافات کی عظمت پارینہ کے درخشاں نشانات وادی سندھ میں موجود سرائیکی وسیب کے تہذیبی خدوخال کو

بھی اجاگر کرتے ہیں۔

وادیِ سندھ کے تاریخی اور نیم تاریخی واقعات کے ابتدائی ادوار کی تفصیل زیادہ تر قرائن پر مبنی ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ سندھ دارائے اعظم (تخت نشینی ۔۵۲۱ ق م) کی سلطنت کا گنجان آباد ترین اور دولت مند ترین صوبہ تھا۔ وادیِ سندھ ایران کو سالانہ ۳۶۰ سونے کے سکے خراج کے طور پر دیتا رہا ہے (۱۰)۔ جب کہ سندھ پر حملوں کے حوالے سے سکندر کے حملے کو مورخین خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔

یحییٰ امجد نے یونانی بادشاہ سکندر کے حملے کی ایک جھلک بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس زمانے میں مالو لوگ ملتان اور ساہیوال کے علاقے میں اور شودرک بہاول پور کے علاقے میں آباد تھے۔ مالووں سے سکندر کی جنگ ملتان کے قریب ہوئی۔ جھنگ کے علاقے سے نکل کر سکندر کی فوجیں ساہیوال کے علاقے میں پھیل گئیں اور ہر طرف قتل عام کرتی ہوئی اس سمت چلیں جہاں اب ملتان ہے۔ رستے میں بکھرے ہوئے جگہ جگہ کام کرتے ہوئے نہتے لوگ اگر نظر آ جاتے تو انہیں قتل کر دیا جاتا۔ کچھ لوگ بھاگ کر جنگلوں میں چھپ جاتے تھے۔ انہیں بھی تعاقب کر کے ڈھونڈ کر قتل کر دیا جاتا تا کہ ان کی آمد کی اطلاع اگلے شہروں میں نہ پہنچ سکے۔ مالووں کے پایہ تخت ملی پہنچنے کے بعد زبردست جنگ ہوئی۔ یہ جگہ ملتان سے اسی نوے میل شمال مشرق میں واقع تھی۔ غالباً موجودہ تلمبہ کے مقام پر۔ یہاں خونخوار جنگ کے بعد ایک سو تیس مالو سرداروں نے اطاعت پیش کی اور تحفے تحائف سکندر کی نذر کیے۔ یہاں سے وہ کشتری قوم کے علاقے میں آیا یعنی وجند میں۔ انہوں نے کئی جہاز بطور نذرانہ پیش کیے اور اپنے علاقے کی دستاویز لکھ کر اس کے حوالے کی۔ دوسری قوم جو یہاں مقیم تھی، وساتی کہلاتی تھی اس نے بھی اطاعت قبول کی۔ وجند میں اس نے کافی دن قیام کیا"۔(۹)

ملتان اور وجند (اوچ) کے علاقوں پر سکندر کے حملے تو تاریخ کا حصہ ہیں لیکن اس جنگجو بادشاہ کا ملتان کے تیر انداز کے ہاتھوں گھائل ہونا بھی تاریخ کے اوراق پر درج ہے۔ سکندر کی واپسی کے بعد چندر گپت موریہ کا عہد بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رہا۔ موریہ خاندان میں اشوک نے بدھ مت کی سرپرستی کی۔ اس عہد میں فن تعمیر اور فن سنگ تراشی کو فروغ حاصل ہوا۔ سٹوپے، مینار اور محلات فن تعمیر

Mir Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

کے نمونے اور ان پر نصب کتبات سنگ تراشی کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔ موریہ خاندان کے بعد ملتان با
ختری یونانیوں کے حملوں کی زد میں آیا۔ باختری حکومت کو خانہ بدوش ساکا کی قوت نے زیر کیا۔ آخر کار ۵۷ ق م
میں "ملی" قوم کے قبیلوں نے یکجا ہو کر ساکا پر حملہ کیا اور اسے ملک سے باہر نکال دیا۔ اسی فتح کی
یادگار میں ملی قوم نے "کیلنڈر ملاوا" جاری کیا۔ صدیوں بعد ملی قوم کے فرزند راجا بکرماجیت نے غیر ملکی
حملہ آور قوم "سفید ہن" کو شکست فاش دی تو "کیلنڈر ملاوا" کو بکرماجیت کی نسبت سے "کیلنڈر بکرمی"
کا نام دے دیا گیا (۱۲) گویا ملتان سے آغاز کرنے والا یہ کیلنڈر لمحہ موجود میں بھی پورے برصغیر پاک و
ہند میں رائج ہے۔

کشان عہد کو برصغیر کا اہم دور گردانا جاتا ہے۔ کنشک کو کشان خاندان کا عظیم بادشاہ مانا جاتا
ہے جس کو بدھ مت کی اشاعت کے سلسلے میں اشوک کا ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے۔ سرائیکی وسیب میں بدھ
مت کی یادگار "سوئی وہار" مہاراجا کنشک کے عہد میں دریائے سندھ کے کنارے بنائی جانے والی عبا
دت گاہوں کی ایک کڑی ہے (۱۳)۔ کنشک عہد کے بے شمار سکے دریافت ہو چکے ہیں جو اس دور میں ہو
نے والی تجارت کا پتا دیتے ہیں۔

سندھ کے زرخیز اور دولت مند ملک ہونے کی وجہ سے مقامی حکمرانوں کے دور حکومت میں بھی
تجارت کو فروغ حاصل رہا۔ جس زمانے راجا چچ کا بیٹا داہر راج کرتا تھا۔ اس کی دو راجدھانیاں تھیں۔ شمال میں
اروڑ (روہڑی کے قریب) جہاں راجا سال کے آٹھ مہینے گزارتا تھا اور جنوب میں برہمن آباد (شہدادپور
سے آٹھ میل جنوب مشرق میں)۔ ریاست چار صوبوں ملتان، اسکندہ (اوچ)، سیوان اور برہمن آباد
میں بٹی ہوئی تھی۔ ہر صوبے کا ایک گورنر ہوتا تھا جو ضرورت پڑنے پر راجا کی فوج کے لیے سپاہی بھی بھرتی
کرتا تھا (۱۴)۔

چوتھی صدی ہجری کے شروع میں معروف سیاح مسعودی نے ملتان اور سندھ کی الگ الگ شنا
خت کا تذکرہ کیا ہے جسے عبدالحلیم شرر کے الفاظ میں یوں تحریر کیا گیا ہے:

> "۳۰۳ھ (۹۱۵ء) میں ملتان، حکومت منصورہ کے تابع فرمان نہ تھا۔ منصورہ
> کے ہباری خاندان کی حکومت صرف منصورہ اور گرد و نواح کے اضلاع تک محدود
> تھی۔ ملتان میں اس کے ہم رتبہ و ہم قوت ایک دوسری حکومت قائم ہو گئی تھی
> (۱۵)۔

ملتان میں موجود مرکزی بت (سورج دیوتا) کی یاترا کے لیے ہندو دور دراز کی مسافت طے کر کے آتے تھے۔ اس مورتی کے باعث یہاں کے حاکم خوب نذرانے وصول کرتے رہتے۔ ہندوؤں کی قدیم عبادت گاہ کی وجہ سے جو سامہ کی اس حکومت کو پڑوس کے راجوں سے ہمیشہ خطرہ رہا جس کے بارے میں ملتان کے مورخ عتیق فکری نے اطہر مبارک پوری کا تبصرہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ملتان کے بت خانہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہندوستان بھر کے ہندو راجوں مہاراجوں کو بے چین رکھتا تھا۔ خاص طور سے قنوج کے راجے اور دیگر مہاراجے رات دن ملتان کی سامی حکومت کے در پے رہتے تھے۔ اسی لیے ابتدا ہی سے ہو سامہ نے ملتان میں بھاری لشکر جمع کر رکھا تھا۔" (۱۶)

ایک روایت کے مطابق ہندو راجوں میں جو کوئی ملتان پر چڑھائی کرتا تو حاکم ملتان بت خانے کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور مرکزی بت (سورج دیوتا) کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی دھمکی دیتا۔ چونکہ ایک ہندو راجا کو یہ کسی طرح پسند نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنا لشکر واپس لے جاتا۔ (۱۷)

مغل عہد میں ملتان کو اہم صوبہ گردانا جاتا تھا۔ اس زمانے کی معروف ضرب المثل ہے "محیط ملتان مضبوط اوشاہ ولی مضبوط" یعنی جس بادشاہ کا ملتان پر قبضہ ہوتا اس کا دلی پر قبضہ مضبوط ہو جاتا تھا (۳۱)۔ ۱۷۷۹ء سے ۱۸۱۸ء تک ملتان کا زمام اقتدار نواب مظفر خان سدوزئی کے ہاتھ میں رہا۔ ۱۸۱۸ء میں رنجیت سنگھ نے ملتان کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔

ملتان کی اس لڑائی میں نواب مظفر خان اپنے آٹھ بیٹوں اور بھتیجوں کے ہمراہ قلعے میں رہا اور آخر دم تک لڑنے کے لیے تلوار ہاتھ میں پکڑ لی۔ اس افغان تلوار نے بہت زیادہ دشمنوں کو کاٹ ڈالا۔ سفید ریش نواب نے پناہ کی درخواست کو حقارت سے مسترد کر دیا اور آخر کار لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے پانچ بیٹے بھی کام آئے (۱۸)۔

ملتان پر قبضہ کے بعد مہاراجا رنجیت سنگھ نے لاہور میں آٹھ روز تک جشن منایا۔ یوں ملتان تخت لاہور کے زیر نگیں ہو گیا۔ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۲۱ء تک ملتان کے سکھ حاکم تبدیل ہوتے رہے۔ بعد ازاں دیوان ساون مل کی تعیناتی پر معاملات کی نئی صورت ظاہر ہوئی۔ زمینداروں کو باقاعدگی سے مالیہ ادا کرنے کا پابند کیا گیا اور دیوان کی جانب سے لاہور کو اچھی خاصی رقم بھجوائی جاتی رہی۔ ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ اور جھنگ کا زیادہ تر حصہ بھی دیوان ساون کی زیر نگرانی ہو گیا۔ سکھ راج کے حوالے سے دیوان ساون مل کے بعد

اس کے بیٹے دیوان مول راج نے یہاں اقتدار کی تاریخ رقم کی۔ آخرکار ۱۸۴۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے کے ساتھ ہی ملتان میں فرنگی اقتدار کا دور شروع ہو گیا۔

ملتان نے جہاں سیاسی طور پر اتار چڑھاؤ دیکھے وہاں ملتان میں پروان چڑھنے والی صوفیانہ روایت نے یہاں کی تہذیب و تمدن پر گہرے اثرات چھوڑے۔ سومرا خاندان کے دور حکومت کے دوران ۱۰۸۸ء میں روحانی پیشوا حضرت شاہ یوسف گردیزؒ کی آمد سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے پرہلاد مندر کے قریب قلعہ کہنہ پر رشد و ہدایت کا سلسلہ عام کیا۔ حضرت شاہ رکن عالمؒ نے سلسلہ سہروردیہ کا خرقہ زیب تن کیا۔ حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ نے ملتان کو قادریہ سلسلے کا محور بنایا۔ حافظ جمال ملتانیؒ نے سلسلہ چشتیہ کو متعارف کرایا اور حضرت شاہ شمس سبزواریؒ صاحبِ جلال ولی مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ بھی متعدد صاحب کشف و کرامات مشائخ گزرے ہیں جن کے باعث ملتان کو روحانی اعتبار سے سجدہ گاہ ملائک کہا جانے لگا۔

سرائیکی وسیب کے تہذیبی و تمدنی سلسلے کا مرکزی شہر ملتان حملہ آوروں کی آماجگاہ رہنے کے باوجود ترقی کی منازل طے کرتا رہا۔ آثار السنادید، فصیل شہر، قلعہ، صوفیائے کرام کی آرامگاہیں، پختہ مکانات، ہتھیار اور اوزار، پارچہ بافی، نقاشی، کاشی گری، صنعت و تجارت، خوراک، زراعت، رسوم و عقائد اور طرز تعمیر بلند پایہ تہذیب و تمدن کے آئینہ دار ہیں۔

ابن حنیف ملتان کو وسیب کا سب سے اہم شہر قرار دیتے ہوئے اس کی قدامت کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

> ”فصیل کے اندر ملتان شہر کی صورت حال ذہن میں رکھیں تو یہ حقیقت نکھر آئے گی کہ سارا شہر کافی اونچائی پر واقع ہے۔ گلیوں اور بازاروں میں گھومیں پھریں تو بے شمار نشیب و فراز سامنے آتے ہیں۔ گلیاں کہیں تو بہت اونچی ہو جاتی ہیں اور کہیں بہت نیچی۔ جس اونچائی پر ملتان آباد ہے وہ قدرتی ہرگز نہیں بلکہ ہزارہا برس کے مسلسل تعمیری اور تخریبی عمل کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ گزشتہ کم از کم پانچ ساڑھے پانچ ہزار برس کے دوران ملتان کتنی ہی بار آباد اور برباد ہوا۔ اور یہ تباہ کاریاں دریائی سیلابوں اور حملہ آوروں کی بھی لائی ہوئی ہو سکتی ہیں اور دیگر آفاتِ سماوی کی نازل کردہ بھی۔“ (۱۹)

ملتان کی قدامت اور تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اسے نہ صرف وادی سندھ بلکہ بر صغیر میں تہذیب و تمدن کا ایک بڑا مرکز شمار کیا جاتا رہا ہے۔ ملتان کے گرد و نواح میں موجود سرائیکی وسیب کے دیگر خطے بھی منفرد تہذیبی شناخت کے حامل ہیں۔ جغرافیائی حوالے سے یہ خطے انفرادی طور پر ان ناموں سے پہچانے جاتے ہیں:

۱۔ روہی

۲۔ تھل

۳۔ دامان

روہی:

روہی کی قدیم تہذیب کو وادی ہاکڑا کی تہذیب سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وادی ہاکڑہ بہاول پور، بہاول نگر اور رحیم یار خان کے اضلاع پر مشتمل ہے، ہاکڑہ تمدن کی دریافت کے لیے ڈاکٹر رفیق مغل نے بیسویں صدی کی ستر کی دہائی میں سروے کیا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ "ہاکڑہ دور" کو "ہڑپائی دور" سے بھی اولیت حاصل ہے۔

وادی ہاکڑہ کے آثار کا تعلق ایک ہزار تا چار ہزار ق۔م کے زمانے سے بتایا جاتا ہے۔ صحرائے چولستان میں گنویری والا کے مقام پر موئن جو دڑو جتنے وسیع و عریض شہر کے آثار دریافت ہوئے۔ خیال ہے کہ گنویری والا کا رقبہ ۸۱ ایکڑ جبکہ موئن جو دڑو کا رقبہ ۸۳ ایکڑ ہے۔ محل وقوع کے اعتبار سے یہ شہر موئن جو دڑو اور ہڑپہ کے عین وسط میں واقع ہے۔ اس کے علاوہ دراوڑ کے قریب دو شہروں کی باقیات کا علم ہوا۔ (۳۶)۔ ریگزار روہی کی دیگر مدفون بستیوں میں سرواہی (قصبہ ججہ پور تحصیل صادق آباد)، ٹب دانیکا (نزد قصبہ قائم پور)، لیہ نکل (ضلع بہاول نگر)، بجنوٹ اور بچن منارا کے نام خاص طور پر لیے جاتے ہیں۔

روہی و لق و دق صحرا ہے جہاں کے باسیوں کی خانہ بدوشی پانی کے ٹوبھوں کے گرد گھومتی ہے اور مسافر زمانہ حاضر میں بھی پیدل یا اونٹوں پر سفر کرتے ہیں، بھول بھلیوں سے بھرے اس پُر خطر ریگزار ارضی کو "پُر وحشت تھری روہی" کا نام دیا گیا۔ لیکن جمالیاتی حسن کی اس چادر نے سرزمین چولستان کو اس قدر خوبصورت اور پُر کشش بنا دیا ہے کہ اسے "روہی رنگ رنگیلی" سے بھی موسوم کیا گیا۔ گرم دنوں اور سرد راتوں کی لحظہ بہ لحظہ رنگ بدلتی روہی کو ریت کا ایسا سمندر کہا جا سکتا ہے جس میں کشش کے ساتھ ساتھ

Mir Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

کسک بھی پائی جاتی ہے۔

روہی کے روپ سروپ جہاں ہاکڑہ تہذیب کے قدیم آثار اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔ وہاں قدیم شہروں خصوصاً اوچ میں پائے جانے والے صوفیانہ تہذیب کے آثار میں حضرت سید صفی الدین گازرونیؒ، مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، سید جلال الدین سرخ بخاریؒ، سید صدرالدین راجو قتالؒ اور بی بی جیوندیؒ کے مقبرے رفتہ رفتہ کھنڈرات کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی عہد میں "اوچ" علم و حکمت کا اہم مرکز تھا، یہاں کا "مدرسہ فیروزیہ" معروف علمی اور روحانی ادارہ شمار کیا جاتا تھا۔ برصغیر کی متعدد روحانی شخصیات کسی نہ کسی حوالے سے اوچ سے منسلک رہی ہیں۔ "اوچ" بلھے شاہ کا ابتدائی وطن ہے، بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے اس شہر کی تاریخی "مسجد حاجات" میں مجاہدے کیے، خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ نے اسی مسجد میں چلہ کاٹا اور اعتکاف فرمایا، ہم عصر صوفیائے کرام حضرت بہاء الدین زکریاؒ، حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت لعل شہباز قلندرؒ اور اوچ کے مشہور بزرگ سید جلال الدین سرخ بخاریؒ کو آپس میں چار یار کہا جاتا ہے۔

روہی کی قدامت کو واضح کرتے ہوئے مجاہد حسین کی کتاب "بہاول پور: خوشحال ریاست سے پسماندہ ڈویژن تک" میں تحریر کیا گیا ہے:۔

> "بہاول پور ڈویژن کے تیرہ ہزار مربع میل پر پھیلے ہوئے صحرائے چولستان کے کھنڈرات اپنی آغوش میں شاندار ماضی اور ایک قدیم تاریخ لیے ہوئے ہیں۔ دنیا کی تمام تہذیبوں کی طرح صحرائے چولستان کی قدیم تہذیب بھی ایک دریا کی وادی میں وجود میں آئی تھی۔ دریائے ہاکڑا کے کنارے بسنے والی ان ویران آبادیوں کے کھنڈروں سے پرانے ٹھیکرے کے جو برتن برآمد ہوئے ہیں۔ وہ اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہیں کہ یہ علاقہ کسی دور میں تہذیب و تمدن اور تجارت و سیاست کے حوالے سے ایک اہم خطہ تھا"۔(۲۰)

پیاس کا دریا ہے اک پھیلا ہوا میلوں میں ہے
دلکشی روہی کی گم ریت کے ٹیلوں میں ہے

CamScanner

تھل:

تھل بھی ریت کے ٹیلوں پر مشتمل خطۂ ارضی کا نام ہے۔ جغرافیائی طور پر دیکھا جائے تو دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ ضلع میانوالی سے لے کر ضلع مظفر گڑھ کی تحصیل کوٹ ادو اور جھنگ، خوشاب، بھکر اور لیہ ضلعوں کے متصل علاقے جہاں کچھ عرصے پہلے ریت کے ٹیلے ہوا کرتے تھے اور کچھ علاقوں میں آج بھی وہی منظر ہے، تھل کہلاتا ہے۔ تھل کی ایک طرف دریائے سندھ بہتا ہے اور دوسری طرف کچھ فاصلے تک دریائے جہلم کا ساتھ ہے لیکن پھر تریموں کے مقام پر جہلم و چناب اکٹھا کر کے تھل کے ہمراہی بن جاتے ہیں اور پھر راوی بھی ان سے آن ملتا ہے۔ اس کے باوجود تھل نے ہزاروں برس کی پیاس کاٹی ہے۔ ضلع خوشاب کو کندیاں سے ملانے والی ریلوے لائن دوآبہ سندھ ساگر کو تھل سے جدا کرتی ہے۔ اگر اسی مقام کو تھل کی ابتدا مان لیا جائے تو تھل کی لمبائی تقریباً 190 میل اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی 70 میل بنتی ہے لیکن زیادہ تر یہ چوڑائی دس سے تیس میل کے درمیان ہے اور مسلسل گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس طرح تھل کا اوپری سرا کافی چوڑا ہے لیکن جوں جوں ضلع بھکر سے ضلع مظفر گڑھ کی طرف بڑھتے ہیں، اس کی چوڑائی کم ہوتی چلی جاتی ہے اور آخر کار ضلع مظفر گڑھ میں ایک نوک کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ علاقہ تھل ایک بے قاعدہ مثلث کے مماثل ہے۔ (۳۱)

ڈاکٹر مہر عبدالحق نے تھل کی قدرتی تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "تھل اپنے آپ دو قدرتی حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک کو تھل کلاں یا 'تلا تھل' کہتے ہیں دوسرا ڈگر یا تھل جنڈی کہلاتا ہے۔ جنڈی اس لیے کہ یہاں جنڈی، کریا اور کیکر کے درخت بکثرت ہیں۔ ڈگر ایسی زمین کو کہتے ہیں جس میں ریت کے بڑے ٹیلے نہ ہوں اور یہ سخت ہونے کے باوجود قابل کاشت ہو۔ ڈگری کی معیشت کا انحصار زیادہ تر چاہی آبپاشی پر ہوتا ہے چونکہ یہاں بارش کم ہوتی ہے اس لیے زندگی درخت بھی کم ہیں ڈگر کے مشرق میں ہر طرف ریت ہی ریت ہے۔ کہیں کہیں صحرائی پودوں کی جھاڑیاں دکھائی دے جاتی ہیں۔ بارش ہوگئی تو ہری بھری ہو جاتی ہیں۔ نہ ہوئی تو سوکھ جاتی ہیں۔ یہ حصہ تھل (کلاں) صحیح معنوں میں صحرا ہے"(۳۲)

تھل کا علاقہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ ہونے کے باعث یہ بات زبان زد عام ہے

کہ سور اور بھیل یہاں کے قدیم باسیوں میں شامل ہیں۔ دریائے سندھ کی لہروں پر حکومت کرنے والے یہ لوگ کشتیوں اور جہازوں کے ذریعے وادی سندھ کی اشیاء مصر اور بابل وغیرہ تک پہنچاتے تھے اور پھر وہاں سے کاشتکاری کے آلات یہاں لے آتے ہیں۔ ماضی قریب تک یہی اقوام اپنی کشتیوں میں کالاباغ سے کراچی کی بندرگاہ تک سامان تجارت پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ میانوالی، ڈیرہ اسماعیل خان، بھکر، لیہ اور ڈیرہ غازی خان میں ہندو تاجروں کی منڈیاں قائم تھیں۔ کلورکوٹ، منکیرہ اور بھکر میں بنے والا کپڑا، گرم اونی چادریں، کھیس، دریاں، چاندی کے علاوہ ہاتھی دانت کا ایسا شاندار کام ہوتا تھا کہ دور دور تک ان کی مانگ تھی۔ (۲۳)

علاقہ بائے تھل سے ملنے والی باقیات سے پتہ چلتا ہے کہ اشوک کے زمانے میں یہاں بدھ مت کا رواج تھا۔ کیونکہ تھل کے ٹیلوں سے مہاتما بدھ کی مورتیاں اور ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑوں پر بنی ہوئی بدھ کی تصاویر وسیع پیمانے پر حاصل ہوئی ہیں۔ (۲۴)

ریت کے ٹیلوں کے باعث تھل کی رات ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی ہے جب کہ دن میں لو اور آندھیاں یہاں کا معمول ہیں۔ قدیم لوگوں کا آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ مویشی پالنا تھا۔ لوگوں کے پاس اونٹ، گائیں، بھیڑیں، بکریاں اور گھوڑے کثرت سے ہوتے تھے۔ تھل کی قدیم آبادیوں میں کوٹ کہروڑ، بیت پور، منکیرہ، حیدرآباد تھل، نور پور تھل، لدھانہ، چوبارہ، جنڈانوالہ، خانسر، گھوڑکوٹ، کوٹ ادو، دائرہ دین پناہ اور بصیرہ کے نام خاص طور پر معروف ہیں۔ منکیرہ کا قلعہ اپنی مضبوطی اور وسعت کے اعتبار سے علاقہ تھل میں خاصی شہرت کا حامل تھا۔ کوٹ کہروڑ کو حضرت بہاء الدین زکریا اور حضرت مخدوم رشید جیسے بزرگوں کی جنم بھومی کا اعزاز حاصل ہے۔ بیت پور کو ایک عہد میں ریاست کی حیثیت حاصل تھی، بصیرہ دراصل بسیرا ہے جہاں سکندر کی فوج نے کچھ دن قیام کیا تھا۔ (۲۵)

ماہرین طبقات الارض کے مطابق تھل قدیم زمانے میں کوئی بڑا "جھیل" اور سمندر ہوگا جو کہ ارضی تغیرات سے ریگستان بن گیا۔ ماہرین اسے صحرائے بیکانیر کے مشابہ قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی تھل بحر اور روہی میں جغرافیائی ملاپ پیدا کرتے ہیں۔

صحرا اصل میں دریا ہو گا
دریا میں گم صحرا ہو گا (۲۶)

دمان:

روہی اور تھل میں پائے جانے والے ریت کے ٹیلے جہاں انفرادیت کے حامل ہیں وہاں دما
ن کا خطہ پہاڑ اور دریا کے درمیان ہونے کے باعث اپنی منفرد پہچان رکھتا ہے۔ دمان کے مغرب میں کوہ
سلیمان کا پہاڑی سلسلہ اور مشرق میں دریائے سندھ بہتا ہے۔ کوہ سلیمان کے دامن میں واقع ہونے کی
وجہ سے اس علاقے کو دمان کا نام دیا جاتا ہے۔ [illegible] موجودہ میں راجن پور، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل
خان اور ٹانک کے اضلاع اس خطے میں شامل ہیں۔

دمان ایک زرعی خطہ ہے جہاں آبادی کا [illegible] پہاڑ سے آنے والے پانی کے باعث ہوتا
ہے۔ جسے مقامی طور پر "لمّی" کہا جاتا ہے۔ اس رودکوہی کے لیے خاص راستے بنائے جاتے ہیں۔ عام
طور پر یہ پانی ساون اور بھادوں کے مہینوں میں پہاڑوں پر ہونے والی بارشوں کے باعث دستیاب ہوتا
ہے۔

دمان میں بلوچ قبیلے سب سے زیادہ آباد ہیں۔ ایک روایت کے مطابق لنگاہ خاندان سے
تعلق رکھنے والے ملتان کے حکمران سلطان حسین خان لنگاہ نے مکران اور سیستان کے بلوچوں کو مرا
عات دے کر اس خطے میں آباد کیا۔ اس طرح آبی گزرگاہیں اور پہاڑی دروں کے سامنے مضبوط قبائلی
حصار قائم کر دیا گیا جس کے نتیجے میں ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ فتح خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے ناموں
سے نئے شہر آباد کیے گئے (۲۷) جو کہ ڈیرہ جات کے طور پر پہچانے جانے لگے۔ یہ تینوں شہر دریائے
سندھ کے کنارے موجود ہونے کے باعث کئی بار دریا برد ہونے کے بعد پھر سے آباد ہوئے۔ ڈیرہ غازی
خان اور ڈیرہ اسماعیل خان تو نئے مقامات پر نئے سرے سے آباد ہو گئے لیکن ڈیرہ فتح خان نئے مقام پر نہ
بسائے جانے کی وجہ سے دورِ حاضر میں ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے درمیان ایک بستی "فتح خان
" کے نام سے موجود ہے۔

برطانوی عہد میں ضلع ڈیرہ غازی خان (موجودہ ضلع ڈیرہ غازی خان اور ضلع راجن پور) کے بلو
چ سرداروں کی وفاداریاں حاصل کرنے کے لیے تمن داری نظام قائم کیا گیا۔ "تمن" ترکی زبان کا لفظ ہے
جس کے معانی دس ہزار کے ہیں۔ یعنی ایسا گروہ جس میں دس ہزار اسلحہ بند مرد ہوں تمن کہلاتا ہے (۲۸) اس
طرح ہر قبیلے کے سردار کو تمن دار بنا کر مجسٹریٹی اختیارات، مالی فوائد، جاگیریں اور اعزازی اسناد دے کر
اپنا وفادار بنا لیا گیا۔ بلوچ اکثریت کی آبادی کو تمن مزاری، تمن دریشک، تمن گورچانی، تمن لغاری، تمن کھو

سے، تُمن لُنڈ، تُمن قیصرانی، تُمن بزدار اور تُمن کھتران میں تقسیم کر دیا گیا۔ روایت ہے کہ انگریز راج کی مخالفت کے باعث احکامی فیصلے کے تُمن دار کا فیصلہ ہوتا۔ اس لیے یہ قبیلہ تُمن داری نظام کا حصہ بنا۔ اس حوالے سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پورے قبائلی علاقے میں تُمن قیصرانی، تُمن بزدار اور تُمن لغاری کے علاوہ دیگر قومان کی آبادی بکھری ہوئی ہے اور لوگ موسمی حالات کے مطابق ایک جگہ سے دوسری جگہ پانی، چارے اور شدید گرمی، سردی سے بچاؤ کے لیے پہاڑی و میدانی علاقوں میں نقل مکانی کرتے رہتے ہیں (۲۹)۔

سرائیکی تہذیب کے حوالے سے ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے میں موجود قلعہ "بلوٹ" اور "رحمان ڈھیری" کے آثار قدامت کا پتہ دیتے ہیں۔ راجہ بل کا بنوایا ہوا قلعہ (بل بوٹ) لگ بھگ اڑھائی ہزار سال قدیم ہے اور رحمان ڈھیری کے آثار ایک محتاط اندازے کے مطابق چار ہزار سال سے بھی پرانے بتائے جاتے ہیں۔

کوہِ سلیمان کا ایک گاؤں "چتر وٹہ" تاریخی مقام کی حیثیت رکھتا ہے جہاں ایک تاریخی نایاب چٹان موجود ہے جس پر پرانی تہذیب کی تحریر کندہ ہے۔ چتر وٹہ کے علاقے سے ملنے والے آثار کے مطابق اس علاقے کی تہذیب کو ہڑپائی تہذیب کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے کیونکہ یہاں سے ملنے والی نشانیاں بالکل ہڑپائی تہذیب کی مہروں کی طرح ہیں۔ چٹانوں پر کھدی ہوئی شبیہیں ہڑپائی تہذیب کے دیومالائی کردار سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس علاقے سے ملنے والی تحریریں دیوناگری، براہمی اور گیتا رسم الخط سے ملتی جلتی ہیں اور کچھ الفاظ تو بالکل ہڑپائی لوگوں کے رسم الخط جیسے ہیں جو کہ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا۔ (۳۰)

ضلع ڈیرہ غازی خان میں "فورٹ منرو" اور ضلع راجن پور میں "ماڑی" کو سرائیکی وسیب کے صحت افزا، تہذیبی اور ثقافتی مقامات کہا جا سکتا ہے جہاں اہم سہولیات کے فقدان کے باوجود موسمِ گرما میں سیاحت کے سلسلے جاری رہتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ حفیظ خان، "تاثر ملتان"، جلد اول، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۱ء، ص ۳۱

۲۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷

۳۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، چودھویں جلد، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء، ص ۲۵۷

۴۔ محمد ادریس صدیقی، وادی سندھ کی تہذیب، لاہور: گلشن ہاؤس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۲

۵۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۶۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، چودھویں جلد، ص ۲۵۷

۷۔ ابن حنیف، سات دریاؤں کی سرزمین، لاہور: گلشن ہاؤس، ۱۹۹۷ء، ص ۳۳

۸۔ محمد ادریس صدیقی، وادی سندھ کی تہذیب، ص ۲۷

۹۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۰۔ یحییٰ امجد، تاریخ پاکستان: قدیم عہد، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۲۰

۱۱۔ یحییٰ امجد، تاریخ پاکستان: قدیم عہد، ص ۱۲۱

۱۲۔ نور علی ضامن حسینی، مہد معارف سرائیکی، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۰۹ء، جز دوم، ص ۱۲۲،۱۲۳

۱۳۔ صدیق طاہر، وادی ہاکڑہ اور اس کے آثار، بہاول پور: اردو اکیڈمی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۵۰

۱۴۔ ابن حنیف، سات دریاؤں کی سرزمین، ص ۳۱۷

۱۵۔ عبدالحلیم شرر، تاریخ سندھ، کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۲ء، ص ۲۷۵۔۲۷۶

۱۶۔ عتیق فکری، نقش ملتان، جلد اول، ملتان: فکری اکیڈمی و مجلس ترقی و ثقافت، ۱۹۸۲ء، ص ۳۳۲

۱۷۔ عتیق فکری، نقش ملتان، جلد اول، ص ۳۶۷

۱۸۔ میکلیگن، ای ڈی، تاریخ ملتان (گزیٹیئر آف ملتان)، مترجم: یاسر جواد، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۲۰۱۲ء، ص ۸۱

۱۹۔ ابن حنیف، سات دریاؤں کی سرزمین، ص ۲۷

۲۰۔ مجاہد حسین، بہاول پور خوشحال ریاست سے پسماندہ ڈویژن تک، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۱۸۔۱۹

۲۱۔ اکرم میرانی، گریٹر تھل، ملتان: جھوک پبلشرز، ۱۹۹۳ء، ص ۲۰

CamScanner

M سرائیکی زبان: تاریخ کے آئینے میں

عرفِ عام میں زبان کو اظہار کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔ انسان کا ابتدائی اظہار آواز کے بجائے اشاروں اور کنایوں کی صورت میں ملتا ہے۔ بعد ازاں جب قدیم انسان نے کسی شے کے متعلق ایک ہی طرح کی اصوات کا اظہار کیا تو اہلِ فکر نے اسے زبان کے ابتدائی تصور سے تعبیر کیا۔ رفتہ رفتہ اس تصور کو جانچنے اور پرکھنے کا عمل جاری رہا۔

ماہرینِ لسانیات نے زبان کی تعریف اپنے اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے زبان کی تعریف کچھ یوں کی :

"زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوتِ گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادہ سے دہرا سکتا ہے"۔(۱)

مولوی عبدالحق کے مطابق:

"زبان بھی ایک انسانی عمل یا فعل ہے۔ اس کے دو رخ ہیں۔ ایک طرف تو یہ عمل اس شخص کی طرف سے ہے جو اپنے دل کی بات دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہے۔ دوسری طرف اس شخص کی جانب سے ہے جو دوسرے کے دل کی بات سمجھنے کی کوشش کرتا ہے"۔(۲)

وارث سرہندی نے زبان کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

"زبان اظہار کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی قوم کی روایات، اخلاقی اقدار اور تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے"۔(۳)

زبان کی تعریف کے سلسلے میں احتشام حسین رقم طراز ہیں:

"زبان محض چند آوازوں کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ صوتی علامتوں کا ایک ایسا نظام ہے، جس کی مدد سے کسی سماجی گروہ کے افراد ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں اور

اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں"۔(۴)

ان تعریفوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے اشاروں اور کنایوں سے شروع ہو کر قوت گویائی کے خاص مقام تک اپنی بات دوسروں تک پہنچانے اور دوسروں کی بات سن و سمجھنے کا عمل زبان کے زمرے میں آتا ہے۔

عام طور پر ہمسایہ زبانیں الفاظ کے اخذ و قبول کے عمل سے گزرتی رہتی ہیں جس کے باعث یہ زبانیں ایک دوسری کے اثرات یا الفاظ سے خالی نہیں ہوتیں۔ پروفیسر ممتاز حسین اردو اور پاکستانی زبانوں کے اشتراک کی نوعیت واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"پاکستان کے پانچ بڑے لسانی علاقے ہیں: پنجابی، پشتو، سندھی، ملتانی، بلوچی
یہ ساری زبانیں اسی ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جس سے اردو کا
تعلق ہے۔ ان میں سے پنجابی، لہندا، ملتانی یا سرائیکی، پشتو اور سندھی یہ بولیاں
اسی ایک شور سینی پراکرت اپ بھرنش کی بیٹیاں ہیں جس کی ایک بیٹی اردو یا
مغربی ہندی یا کھڑی بولی ہے۔ یہ سارے رشتے ناتے اور یہ سارے تاریخی اسبا
ب کمزور پڑ جائیں گے اگر اردو نے مقامی بولیوں سے الفاظ قبول کرنے اور
مقامی لب و لہجہ کی پذیرائی میں خست اور تاخیر سے کام لیا"۔(۵)

پاکستان کے لسانی علاقوں میں وہ علاقہ جس کے شمال مغرب و مغرب میں کوہ سلیمان اور جنوب میں سندھ واقع ہے اور جسے مشرق میں جہلم اور چناب پنجابی زبان کے علاقے سے علیحدہ کرتے ہیں ۔سرائیکی زبان کا خطہ کہلاتا ہے۔(۶)

سندھی زبان کے معروف قلمکار میر چند آڈوانی کے حوالے سے سرائیکی زبان کے جغرافیہ کو واضح کرتے ہوئے سندھی، سرائیکی اور پنجابی کے روابط بیان کیے گئے:

"سندھ کے بالائی حصہ اوباڑو (سکھر) کی طرف سے سرائیکی جسے عرف عام میں 'اُبھے والی بولی' کہتے ہیں، وہ سندھی سے الگ رنگ اختیار کر کے بہاول پور کے
علاقے میں ملتانی زبان کے ساتھ جا ملی ہے۔ اس لیے اس بات میں کسی قسم کا
مبالغہ نہیں کہ سرائیکی زبان ہی وہ درمیانی کڑی ہے جو سندھی کو پنجابی کے ساتھ ملاتی
ہے۔"(۷)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے عین الحق فرید کوٹی کی کتاب "اردو زبان کی قدیم تاریخ" کا پیش لفظ بہ عنوان "تعارف" تحریر کرتے ہوئے سرائیکی اور اس کی ہمسایہ زبانوں سندھی اور پنجابی کے تعلق کو یوں واضح کیا ہے:

> "ایک توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ پنجابی، سرائیکی اور سندھی وادیٔ سندھ کی ہمسایہ زبانیں ہیں لہٰذا پنجابی اور سرائیکی، سرائیکی اور سندھی اور سندھی اور پنجابی میں ایک قریبی لسانی مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے سرائیکی کو سندھی کا جز تسلیم کیا ہے اور ہمارے فاضل مصنف اس کو پنجابی کا ایک لہجہ شمار کرتے ہیں۔ سرائیکی جو کہ اپنے مختلف محاوروں (ملتانی، بہاولپوری، ڈیرہ والی وغیرہ) پر مشتمل اور پنجابی اور سندھی کی درمیانی کڑی ہے، اپنی انفرادی خصوصیات کی حامل ہے۔ لہٰذا سرائیکی کو وادیٔ سندھ کی ایک مستقل زبان تسلیم کرنا حقائق کے زیادہ قریب تر ہوگا۔" (۸)

مستشرقین میں سے ای او برائن نے اس زبان کو "ملتانی" کا نام دیا اور اسے خاص مشرقی زبان کہا۔ سر جارج گریرسن نے سرائیکی زبان کو "لہندا" (مغرب کی زبان) کا نام دیا ہے جنہوں نے ملتان، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان، بہاولپور اور جھنگ کے علاقوں میں اس زبان کا رواج ظاہر کیا۔ روس کے ماہر لسانیات نے اس زبان کو "لہندی" کا نام دیا۔ اسی طرح اینڈریو جوکس نے سرائیکی زبان کو "جٹکی" کا نام دیتے ہوئے پنجابی سے الگ زبان قرار دیا۔

۱۹۵۲ء میں شائع ہونے والی اختر وحید کی کتاب "ذرہ گوہر" کے مقدمہ نگار اسد ملتانی لفظ "سرائیکی" کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ اہل سندھ ملتانی زبان کو سرائیکی کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں سرداروں کی زبان یعنی شاہی زبان، گویا ملتانی زبان سندھی کی اردو نکلتی ہے (۹)۔ "ذرہ گوہر" کے لکھاری اختر وحید نے ملتانی (سرائیکی) زبان کی تاریخ کے حوالے سے اس زبان کو اس قدیم "ملی" قوم کی زبان قرار دیا جس کا اقتدار چٹان بن کر سکندر سے ٹکرایا تھا۔ (۱۰)

پروفیسر شوکت مغل سرائیکی زبان کے آغاز کے حوالے سے نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "سرائیکی زبان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی اس دھرتی کی جہاں یہ زبان بولی

جاری ہے۔ معلوم تاریخ کے مطابق اس خطہ ارضی پر دراوڑوں کی آمد سے قبل کول، بھیل، سنتال اور کوروا، سارا قبائل موجود تھے۔ جنھیں تاریخ میں 'منڈا قبائل' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان قبائل میں کئی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ جن میں سے ایک 'منڈاری' زبان تھی۔ یہ زبان موجودہ سرائیکی زبان سے بہت ملتی جلتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زبان سے سرائیکی زبان کا آغاز ہوا۔ تقریباً ساڑھے پانچ ہزار سال پہلے جب دراوڑوں نے اس دھرتی پر قدم رکھا تو انہوں نے منڈا قبائل کو اپنا محکوم بنا لیا اور یہاں ایک شاندار تہذیب کی بنیاد رکھی جو دو ہزار سال تک ان کا ڈنکا بجاتی رہی۔ موجودہ پاکستان میں ہڑپا اور موہنجوڈرو، دراوڑوں ہی کے تباہ شدہ شہر ہیں جو ان کی باقیات ہی کو نہیں ان کی شاندار تہذیبی ترقی کو بھی پیش کرتے ہیں۔ دراوڑوں نے جس زبان کو یہاں ترقی دی اس میں "منڈاری" زبان کے الفاظ بنیاد کے پتھر کے طور پر کام آئے اور یوں دراوڑ سرائیکی زبان کی بنیادیں مضبوط کرنے کا باعث بنے"۔(۱۱)

مہاتما بدھ کے عوامی زبانوں کو تبلیغ کا ذریعہ قرار دینے کے حوالے سے میر حسان الحیدری نے سرائیکی زبان کے فروغ میں بدھ مت کے کردار کو یوں واضح کیا:

"اشوک کے عہد میں بدھ مت کو فروغ حاصل ہوا تو ملتان شہر اور اس کے نواحی علاقوں میں بھکشوؤں کی ایک بھاری تعداد پہنچ گئی۔ بعد میں کنشک کے زمانہ میں بدھ مت کو نئی زندگی حاصل ہوئی۔ بدھوں کے مقامی زبانوں سے سروکار رکھنے کے باعث جہاں ادھر اُدھر کی مقامی زبانیں ترقی کر رہی تھیں۔ الغرض سرائیکی زبان بھی ارتقا کے مراحل طے کرنے لگی"۔(۱۲)

کسی بھی زبان کے آغاز کے سلسلے میں ماہرین کی بیشتر تحقیق قیاس و مفروضات پر مبنی نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے محمد بشیر احمد ظامی بہاولپوری سرائیکی زبان کی قدامت کے ناطے کو ملتان کی قدامت اور مرکزیت سے جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قرائن و قیاسات سے جو اخذ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ قدیم ترین عہد میں وادی سندھ کا اقتدار ملتانیوں کے ہاتھ میں تھا اور ملتان کو ملتانیوں کی زبان سرائیکی

کے علاقہ جات میں مرکزیت حاصل تھی۔ طویل عرصہ گزر جانے کے بعد جب
مرکزی اقتدار ختم ہو گیا تو زبان بے سہارا ہو کر علاقائی اثرات سے متاثر ہونے
لگی اور مقامی جداگانہ اثرات کے تحت کئی خطوں میں بٹ گئی، پھر ان خطوں کے
لوگ اپنا اپنا رنگ واثر پیدا کر لینے کی وجہ سے اس زبان کی اپنی پسند کے ناموں
سے پکارنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ محققین لسانیات جو اس زبان سے ناآشنا تھے
اور اسے بول اور سمجھ نہیں سکتے تھے اس زبان کے مختلف علاقائی ناموں سے دھو
کہ کھا کر انہیں الگ الگ اور جدا جدا زبانیں سمجھنے لگے لیکن بایں ہمہ ٹکسالی
سرائیکی کو اب بھی مرکزیت حاصل ہے اپنے مرکز یعنی ملتان اور اس کے ملحقہ
علاقہ جات میں اسی طرح قائم و موجود ہے اور اصلیت و حقیقت سے ان تمام غلط
فہمیوں کی تردید و تکذیب کر رہی ہے جو اس کے ناآشنا اور ناشناسا محققین میں
پیدا ہوئی ہیں"۔(۱۳)

سرائیکی ایک ایسی زبان ہے جس کے الفاظ ہندوستان کی تمام بولیوں میں پائے جاتے ہیں اور
اسے چار سو سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے صوفیا کرام نے برصغیر پاک و ہند میں دین کی دعوت کے لیے خاص
طور پر سرائیکی زبان کا انتخاب کیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے ملتان میں کئی برس تک
قیام فرمایا۔ مقامی زبان میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے بعد بغرض اشاعت اسلام اجمیر جا کر
مستقل قیام فرمایا۔ سید جلال الدین بخاری اوچ شریف اور بابا فرید الدین گنج شکر پاک پتن میں
قیام پذیر ہوئے۔ قطب الدین بختیار کاکی ملتان تشریف لائے، قیام فرمایا اور تبلیغ کے بعد دہلی کوچ
کر گئے۔(۱۴)

ڈاکٹر غلام علی الانہ نے سرائیکی وسیب میں پائے جانے والے تصوف کے رنگ سے سندھ اور
ملتان کے سماجی، ثقافتی، روحانی اور لسانی رشتوں کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ سرائیکی زبان کی قدامت
کے ساتھ ساتھ سندھی اور سرائیکی کے روابط بھی واضح ہوتے ہیں:

"اُچ اور ملتان سندھیوں کے لیے روحانی فیض کے مرکز ہیں۔ آج بھی سندھی
قافلوں کی صورت میں یہاں زیارات کے لیے آتے ہیں۔ قدیم زمانے میں
ملتان سے مراد سندھ اور ملتانی سے مراد سندھی استعمال ہوتا تھا۔ یہ نہ ٹوٹنے والے

رشتے آج بھی قائم ہیں۔ اگرچہ ملتان کا علاقہ سیاسی لحاظ سے سندھ سے باہر ہے مگر سماجی، ثقافتی، روحانی اور لسانی رشتوں میں ملتان اور سندھ ایک ہیں۔ (۱۵)

سرائیکی زبان کو مختلف علاقوں میں علاقائی ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے۔ ان علاقائی ناموں کی وضاحت ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی نے ان الفاظ میں کی ہے:

> "بہاولپور کی زبان کو بہاولپوری اور ملتان کی زبان کو ملتانی بھی کہا جاتا ہے ان علاقوں کے ساتھ ڈیرہ غازی خان کا علاقہ بھی ملتا ہے وہاں کی زبان کو ڈیرہ والی بھی کہتے ہیں"۔ (۱۶)

سرائیکی زبان کو "ہندی" نام سے بھی موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ ادبی تحریروں میں بھی ہندی کا نام مختلف لکھاریوں نے شامل کیا ہے۔ مثال کے طور پر خواجہ، قُل جوگی کے شعری مجموعے کا عنوان "مجموعہ کافیاں ہندی" ہے اور اسی طرح معروف سرائیکی شاعر لطف علی نے اپنے کلام کو "ہندی" کہتے ہوئے لکھا ہے۔

ع   لطف بھی دے بیت ہندی تم یاران نال الم دے۔ (۱۷)

پنجابی زبان کے مورخ عبدالغفور قریشی نے ۱۹۵۲ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب میں ۱۹۵۳ء کے تحریر کردہ پیش لفظ (اپنے والوں) میں اس زبان کو سراتی (سرائیکی) لکھا ہے (۱۸)۔

ان متعدد ناموں کے ساتھ ساتھ لفظ "سرائیکی" بالائی سندھ کی زبان کے لیے مستعمل رہا ہے۔ وسیب میں پائے جانے والے متعدد نام زبان کی شناخت کے لیے مسائل پیدا کر رہے تھے۔ جس کے باعث ۱۹۶۲ء میں وسیب کے نمائندہ دانشوروں کا ایک اجتماع سرا پبلک ہائی سکول ملتان میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت مخدوم قاسم خان خاکوانی نے کی۔ دیگر شرکاء میں ریاض انور، ڈاکٹر مہر عبدالحق، سیٹھ عبدالرحمٰن، میر حسان الحیدری، مولانا نور احمد خان فریدی، اختر علی خان بلوچ، علامہ نسیم طالوت اور ارشد ملتانی کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ "سرائیکی" نام کے محرک ریاض انور (ایڈووکیٹ) تھے اور میر حسان الحیدری نے تائید کی۔ اجلاس میں دیگر کئی نام بھی سامنے آئے جنہیں مشاورت کے بعد رد کر دیا گیا۔ اکثریت کا فیصلہ یہ تھا کہ اب ملتان، بہاولپور، ڈیرہ جات (ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان) اور دیگر علاقہ جات میں بولی جانے والی اس زبان کو علاقائی ناموں کے بجا

کے پورے خطے کے لیے "سرائیکی" کہا جائے گا۔(۱۹)

لفظ "سرائیکی" سندھ کے بالائی حصے اوباڑو (سکھر) میں مستعمل ہونے کے باوجود وسیب کے دیگر علاقوں میں اس طرح مستعمل نہیں تھا جس طرح اب ہے۔ پورے خطے کے لیے دیے گئے اس نام کے بارے میں ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز لکھتے ہیں:

> "بیسویں صدی کی پہلی چھ دہائیوں تک جھنگ کی جھنگوچی، ملتان کی ملتانی، ڈیرہ جات کی ڈیروی، بہاول پور کی بہاول پوری اور رحیم یار خان وغیرہ کی زبانوں کو سرائیکی کا نام نہیں دیا جاتا تھا مگر ساتویں عشرے کے آغاز پر اس زبان کے ادیبوں اور دانشوروں نے مل بیٹھ کر زبان و ادب کو ترقی دینے کی خاطر علاقائی لہجوں کے ناموں کو نظر انداز کر کے زبان کے قدیم نام "سرائیکی" کو دوبارہ مروج کرنے کا فیصلہ کیا اور سرائیکی نظم و نثر کی تخلیق و تحریر کے ساتھ اشاعت کی شعوری کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں سرائیکی اخبارات اور بیسیوں رسائل کے اجراء کے ساتھ ساتھ مطبوعہ سرائیکی کتب کی تعداد بھی ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔"(۲۰)

یوں اس زبان کے نام "سرائیکی" کو پورے وسیب کے لیے رواج دینے کا جو فیصلہ ہوا اُسے اس قدر سراہا گیا کہ لمحۂ موجود میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نام ساٹھ کے عشرے سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے اسی طرح موجود تھا جیسے سندھ کے شمالی علاقے میں مروج تھا۔ جہاں تک سرائیکی زبان کے رسم الخط کا تعلق ہے تو اردو حروف تہجی کے علاوہ پانچ اصوات کے متعلق الگ الگ حروف وضع کیے گئے ہیں۔ ان میں سے چار حروف کے ساتھ دو افقی نقاط (:) اور ایک حرف میں (') کی اضافی علامت کا استعمال کیا گیا ہے۔

ٻ ڄ ݙ ڳ ݨ

سرائیکی زبان کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام پاکستانی زبانوں کے وسط میں پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ سرائیکی زبان کا تعلق ہر پاکستانی زبان کے ساتھ گہرا نظر آتا ہے۔ یہ زبان پاکستان کے چاروں صوبوں میں بولی جاتی ہے اور چاروں صوبوں کے لوگوں کو ملانے کا ذریعہ ہے اس لیے اسے مرکزی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

CamScanner

سرائیکی ادب کے ابتدائی نقوش

سرائیکی ادب کے ابتدائی نقوش کے حوالے سے لوک ادب اپنی منفرد پہچان کا حامل ہے۔ لوک ادب سماجی اقدار کو متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ شعری ادب میں پائے جانے والے کئی اقسام کے لوک گیتوں کے علاوہ نثری ادب میں کہاوتوں، محاوروں، پہیلیوں، دعاؤں، بددعاؤں وغیرہ کے ذخائر اور معروف قصوں کہانیوں کو زمانہ قدیم سے سرائیکی لوک ادب میں مسلمہ حیثیت حاصل رہی ہے۔

شعری لوک ادب میں پائے جانے والے لوک گیتوں کے بارے میں ریاض انور رقم طراز ہیں:۔

"لوک گیتوں کا رشتہ اپنی سرزمین اور عوام سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ یہ گیت خود بخود لوگوں کے دلوں سے پھوٹتے ہیں اور ان کے جذبات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ ان گیتوں میں تصنع، تکلف اور کوشش کوئی عنصر نہیں ہوتا۔ اسی بے ساختہ پن اور جذبے کی صداقت کی وجہ سے یہ گیت دلوں میں اتر جاتے ہیں اور دل کے دریا میں ہلچل پیدا کر دیتے ہیں۔"(۱)

سرائیکی زبان کے قدیم علمی سرمایہ کی جانچ پرکھ اور نثری لوک ادب کی وسعت و گیرائی کا اندازہ لگانے کے لیے کہاوتوں کے حوالے سے میر حسان الحیدری کی یہ رائے پیش کی جاتی ہے۔

"قرون وسطیٰ میں طویل جملوں کو مختصر اور چنے تلے لفظوں میں ادا کرنے کا عام رواج ہو گیا تھا۔ سرائیکی زبان اس سلسلے میں برصغیر کی تمام زبانوں کی پیش رو نظر آتی ہے۔ سرائیکی زبان کی کہاوتیں، ضرب الامثال، محاورات اور پند و نصائح آج بھی ہزاروں کی تعداد میں مقبول و مروج اور زبان زد عام و خاص ہیں۔ ان کہاوتوں میں بڑی بڑی فلاسفی سموئی ہوتی تھی۔ نیز ان میں زندگی کے اصول و قواعد پنہاں ہوتے تھے۔ سرائیکی زبان کی ایسی کہاوتیں یا سوتر اگر یکجا کیے جائیں تو بلا مبالغہ بیس ہزار (۲۰،۰۰۰) کے لگ بھگ ہوں گے اور بلا شبہ اتنی تعداد کسی بھی عظیم سے عظیم زبان کے الہامی جملوں یا

حکمت و دانش سے پر ادبی، علمی، قومی، سیاسی اور طنزیہ ضرب الامثال کی نہیں مل سکتی''۔ (۲)

پشت در پشت محفوظ ہونے والی سرائیکی کہاوتوں کو جمع کرنے کے لیے مستشرقین اور سرائیکی زبان کے مقامی ماہرین کے کئی نام سامنے آئے ہیں جن میں سے شوکت مغل کی قابل ذکر کاوش ''سرائیکی اکھان'' کی تین جلدوں میں پندرہ ہزار سے زیادہ کہاوتیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ علاوہ ازیں نثری لوک ادب کی دیگر اصناف پہ بھی کتب بھی تدوین و ترتیب کے مراحل طے کر چکی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوک ادب میں نئے نئے الفاظ کی آمیزش جاری رہی اور ہر عہد میں رونما ہونیوالے واقعات بھی اثر انداز ہوتے رہے۔ اس طرح لوک ادب کا رشتہ دھرتی سے جڑا رہا اور عوامی رنگ غالب رہا۔ گویا تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار ہونے کے باعث لوک ادب نے مختلف ادوار میں اپنی مقبولیت کو قائم رکھا۔ لوک ادب کے ساتھ ساتھ ان ادوار کے اہل قلم کی تخلیقات کا مطالعہ مقصود ہو تو ان کے اولین رنگ و روپ کی گمنامی کا اندازہ ڈاکٹر مہر عبدالحق کی رائے سے لگایا جا سکتا ہے:

''وادی سندھ جس کا ایک اہم حصہ ملتانی زبان کا علاقہ تھا اس قدر پُر آشوب رہی ہے کہ کسی لٹریچر کا صحیح و سالم بچ جانا معجزے سے کم نہیں۔ اس علاقے کو امن نصیب ہوا تو کسی قدر مغلیہ عہد حکومت میں ہوا یا پھر انگریزوں کے زمانے میں ہوا۔ اس سے پہلے کی تاریخ ہنگامہ آرائیوں کی تاریخ ہے اور اس وقت کی کسی تحریر کے نمونے کے ملنے کی امید رکھنا عبث ہے۔ البتہ کچھ چیزیں حافظے کی مدد سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔ مگر ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ یہ زبان کا اصلی رنگ پیش نہیں کر سکتیں۔ مختلف ادوار کے لوگوں نے اپنے دور کی زبان کا رنگ چڑھا دیا ہے۔ اور اس طرح زبان کی صورت اور اس کے اصلی خدوخال آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور اس وقت ہمارے پاس تدریجی ترقی دیکھنے کے لیے یا تاریخی سلسلہ قائم کرنے کے لیے کوئی سرمایہ موجود نہیں۔''(۳)

کسی بھی پاکستانی زبان کے نثری ادب کے مقابلے میں شعری ادبی وسعت کے رجحانات زیادہ ہوتے ہیں۔ سرائیکی ادبی تاریخ کی سراغ رسانی ہمیں مذہبی شاعری تک کا پتہ دیتی ہے۔ جس میں حمد نعت، فقہی مسائل اور مرثیہ جات اسلامی روایات کے آئینہ دار ہیں نیز صوفیانہ شاعری کے کئی رنگ حقیقت

پسندانہ مزاج کے عکاس اور انسانی محسوسات کے ترجمان نظر آتے ہیں۔

قدامت کے لحاظ سے سرائیکی زبان کی پہلی دستیاب کتاب نور نامہ ہے جہاں سے سرائیکی شاعری کی مستقل تصانیف کا پہلا دور شروع ہوتا ہے (۴)۔ نور نامہ ایک طویل نظم ہے جو صدیوں سے سرائیکی وسیب میں پڑھی اور پڑھائی جاری ہے۔ قدیم زمانے میں اسے "نور نامہ ملتانی" کہا جاتا رہا ہے۔ نور نامہ کے دو نسخے سرائیکی وسیب میں بالعموم پڑھائے جاتے ہیں۔ جن میں سے حضرت ملا کا نسخہ قدیم ہے جبکہ دوسرا نسخہ حافظ امرد ہا والا کا ہے۔ (۵)

مسعود حسن شہاب کے مطابق:

"نور نامہ جو ملتانی زبان کا قدیم ترین منظوم رسالہ ہے اس کی زبان معمولی تغیرات سے قطع نظر آج بھی وہی ہے جو ملتان واوچ میں مستعمل ہے۔ اس کتاب کی اپنی شہادت اس کے لب ولہجہ اور اس کے اسلوب بیان کی رعایت سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے بالکل ابتدائی دور میں لکھی گئی۔" (۶)

سرائیکی نثر کے ابتدائی نقوش کی پہچان ہمیں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زبان عہد قدیم میں مختلف ناموں سے موجود ہونے کے باوجود علمی زبان کی حیثیت سے متعارف نہ ہو سکی۔ تاہم عوامی گفت گو اور بے تکلف صحبتوں میں مدت دراز سے مستعمل ہے۔ مشائخ عظام نے تبلیغ و تلقین اور رشد و ہدایت کے لیے عوام مقامی زبان کو اہمیت دی۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ کے ملفوظات میں ایسے متعدد جملے ملتے ہیں جو برجستہ ادا ہو گئے اور یہ الفاظ نقل بہ نقل تاریخ میں محفوظ ہوتے رہے۔ ان صوفیائے کرام میں ساتویں صدی ہجری کے بابا فرید الدین گنج شکرؒ کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ان کے ملفوظات میں شعری رنگ نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ نثر پارے بھی موجود ہیں۔ بابا فریدؒ اور حضرت بہاء الدین زکریاؒ ہم عصر ہونے کے باعث تحائف کا تبادلہ کیا کرتے تھے۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتان سے گاجر بھجواتے تو بابا فریدؒ کی جانب سے پاک پتن کی بیریوں کے بیر بھجوائے جاتے۔ ایک مرتبہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے بابا فریدؒ سے بیر نہ بھجوانے کا شکوہ کیا تو بابا فریدؒ نے برجستہ جواب دیا۔

ٹھوریں ونڄ ٹھورے بیراں ونڄ بیر

تساں نہ گھلیاں گاجراں اساں نہ گھلے بیر (۷)

بابا فریدؒ کا یہ جواب ٹھیٹھ سرائیکی زبان میں ہے سات صدیاں بیت جانے کے باوجود ان الفاظ میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ بابا فرید الدینؒ کی اپنی بھاشا شاعری کے علاوہ متعدد نثری جملے بھی ان سے منسوب ہیں۔ تاریخ کی بیشتر کتب میں ایک روایت درج ہے کہ ایک دفعہ بابا فریدؒ اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو وضو کرا رہے تھے۔ اتنے میں مرشد نے مرید (بابا فرید ؒ) کو دیکھا تو ان کی ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مرشد کے استفسار پر بابا فریدؒ نے مقامی زبان میں بتایا "آنکھ آئی ہے" (۸)۔ سرائیکی زبان میں یہ جملہ دور حاضر میں بھی "اکھ آئی ہے" کے طور مستعمل ہے اور "اکھ آون" سرائیکی زبان کا مقبول عام محاورہ ہے۔ جس سے مراد آشوب چشم ہے۔

تاریخ کی بیشتر کتب میں بابا فریدؒ کی زبان کو "ہندی" کہا گیا ہے جس کی وضاحت ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے اس اقتباس سے کی جا سکتی ہے:

> "اقوال، جملوں یا الفاظ سے اتنی بات تو ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ بابا فریدؒ ہندی زبان جانتے تھے اور بوقت ضرورت اسے استعمال بھی کرتے تھے۔ یہ ہندی زبان وہی تھی جو اس وقت ملتان اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔" (۹)

پنجابی کے مورخ عبد الغفور قریشی بابا فریدؒ کی زبان کے حوالے سے پنجابی میں لکھتے ہیں:

> "آپ دے کلام وچ ٹھیٹھ ملتانی تے لاہوری دوہاں دے نمونے ملدے ہن۔ لاہوری دے نمونے بہت تھوڑے شلوک ہن۔ آپ دے ودھیک شلوک راگنی کافی ملتانی وچ ملدے ہن۔" (۱۰)

بابا فریدؒ کے داماد خواجہ علی احمد صابر تبلیغ و ہدایت کے لیے کلیر شریف (بھارت) میں مقیم ہوئے تو وہاں کے لوگوں کے متعلق کچھ شکایتیں لکھیں جب یہ سلسلہ بڑھا تو بابا فریدؒ نے جواب میں لکھ کر بھیجا "خواہ کھوہ کھا خواہ دودھ کھا" (۱۱)۔ سرائیکی کی ضرب المثل "کھوہ کھایا! دودھ کھا" وسیب کے کئی علاقوں میں اب بھی مستعمل ہے جس سے مراد مجبوراً مستفید ہونے یا لطف و کرم سے فائدہ اٹھانے کا اختیار دینا ہے۔

بابا فریدؒ کے ہم زمان "امیر خسرو کو ملتان میں پانچ سال قیام کرنے کا موقع ملا اس دوران انہوں نے ملتانی زبان کے الفاظ بھی سیکھے اور ان الفاظ کو اپنی شاعری میں برتا" (۱۲)۔ امیر خسرو نے فارسی

CamScanner

اور سرائیکی زبانوں کے امتزاج کے حوالے سے کئی تجربے کیے۔ ان سے منسوب کتاب "خالق باری" سرائیکی فارسی یا قاری سرائیکی لغت پر مشتمل ہے جس میں ہندی سرائیکی کے الفاظ میں فارسی الفاظ، اسما اور اعلام کے معانی بتائے گئے ہیں(۱۳)۔ امیر خسرو نے ملتان میں قید ہونے کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے مقامی طور پر مستعمل زبان کا تذکرہ منفرد انداز میں کیا ہے:

من کہ بر سر نمی نہادم گل

توبرہ بر نہاد و گفتا "چل"(۱۴)

(میں کہ جس نے کبھی سر پر پھول کا بوجھ نہیں اٹھایا تھا اس نے (مجھ) پر تھیلا لادا کر کہا "چل"!)

سرائیکی الفاظ "توبرہ" اور "چل" کو دوسرے مصرعے کے شروع اور آخر کے الفاظ کے طور پر برتا گیا۔ ان میں "توبرہ" تو ایسا لفظ ہے جو سرائیکی اور فارسی دونوں زبانوں میں "گھوڑے کو دانہ کھلانے والا تھیلا" کے طور پر استعمال ہوتا ہے جب کہ "چل" ایک خالص سرائیکی لفظ ہے جو آج بھی فعل امر کے طور پر "چل" کے معنی دیتا ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے مشائخ میں سے مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ایسے ملفوظات متعدد کتب میں شامل ہیں جن سے سرائیکی زبان کے ادبی پس منظر کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلے میں میر حسان الحیدری رقم طراز ہیں:

> "حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اُچی ۱۴ شعبان المعظم ۷۰۷ھ/۱۳۰۸ء کو پیدا ہوئے اور ۱۰ ذی الحجہ ۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء میں ان کا وصال ہوا۔ آپ سے اگرچہ سرائیکی زبان کی کوئی مستقل تصنیف یادگار نہیں، البتہ آپ کے ملفوظات میں بہت سے سرائیکی فقرے اور جملے اب تک محفوظ چلے آ رہے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی میں نہایت شستہ و شگفتہ سرائیکی بولی جاتی تھی۔ بلکہ آپ کے خاندان نے تو احمد آباد (گجرات) جونپور اور بہار وغیرہ میں بھی جا کر سرائیکی زبان کے علم کو بلند کیا۔ سیاحت گجرات کے دوران جب آپ 'بٹوا' پہنچے تو جہاں آپ نے قیام فرمایا اس جگہ کے متعلق کہا کہ 'اقتاں اساڈے باؤ اں دی خوشبو ہے' حسن اتفاق کہ اسی جگہ پر آپ کے پوتے حضرت قطب العالم کا مزار بنا۔ ایک مرتبہ ایک خاص مرید سے کہا 'اساں وی جہانیاں تساں وی جہانیاں' یا اپنے چھوٹے بھائی راجن قتال سے فرمایا کہ 'اساں خواہ چہ تساں را ہے'۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ جب دہلی تشریف لے گئے تو شاہی مہمان تھے۔ چنانچہ اسی قیام میں سلطان فیروز

الدین تغلق کی عیادت کرتے ہوئے دریافت فرمایا کہ 'کاکا فیروز چنگاں ہے؟' (۱۵)

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے حضرت قطب عالم آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں اوچ شریف میں پیدا ہوئے اور ۹ویں صدی ہجری میں جب گجرات کے علاقہ "بٹوہ" میں مقیم تھے تو رات کے اندھیرے میں کسی چیز سے ٹھوکر لگنے کے باعث دفعتاً کہا "لوہا ہے کہ لکڑ ہے کہ پتھر ہے؟" (۱۶)۔ اسی طرح حضرت قطب عالم کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے اپنے ایک فرزند کی پیدائش کے موقعے پر کہا تھا "اساں تھیں وڈا انساں تھیں وڈا مخدوم جہانیاں آیا"۔ (۱۷)

بابا فرید کی بیٹی بی بی عائشہ کے متعلق روایت ہے کہ وہ دکن میں مقیم تھیں اور حضرت شاہ برہان الدین غریب کا معمول تھا کہ آپ ہر جمعے نماز جمعہ کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ایک بار حسب معمول حاضری کے موقعے پر ان کی نگاہ بی بی عائشہ کی صاحبزادی پر پڑی تو متبسم ہوئے۔ جس پر بی بی عائشہ نے بزبان ملتانی فرمایا "اے برہان الدین! اساڈی دھی کہ یہاں ہسدا ہیں"۔ (۱۸)

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کے مطابق سرائیکی میں "مذہبی نثر کافی عرصے سے موجود ہے۔ حکایات ہا برخوردار کا 'بوبل نامہ' اور 'پکی روٹی'، 'مٹھی روٹی' جیسے رسالے مدت کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان رسائل کا انداز تحریر سوالاً جواباً ہے۔ مولوی عبدالکریم کی مشہور کتاب 'نجات المومنین' کی شرح بھی سرائیکی نثر میں لکھی گئی تھی اور بڑی مقبول ہوئی۔ ذاکر صاحبان کی نثر میں لکھی ہوئی تقریریں بھی کافی عرصے سے چلی آتی ہیں۔" (۱۹) قدیم عہد کے یہ نمونے خالص ادب نہ سہی لیکن ادب کے ابتدائی نقوش ضرور واضح کرتے ہیں اور صوفیائے کرام کی عمومی گفتگو اور بے تکلف صحبتوں میں سرائیکی زبان کا استعمال ادب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ چنانچہ سرائیکی ادب کے ان نقوش کی بدولت رفتہ رفتہ اس رفتار سے ترقی ہوئی کہ آج کوئی صنف ادب بھی ایسی نہیں جس سے سرائیکی ادب کا دامن خالی ہو۔

حوالہ جات

۱۔ ریاض انور، پیش لفظ، مشمولہ "سرائیکی لوک گیت" از ڈاکٹر مہر عبدالحق، ملتان: بزم ثقافت، ۱۹۶۷ء، ص ۷

۲۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، چودھویں جلد، ص ۲۶۲-۲۶۳

۳۔ عبدالحق، ڈاکٹر مہر، ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق، ص ۳۳۲

۴۔ نصراللہ خان ناصر، ڈاکٹر، سرائیکی شاعری دا ارتقاء، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۹

دینی ادب

CamScanner

شعری دینی ادب

نعت کے سلسلے کی کڑیاں عربی زبان سے ہوتی ہوئی دیگر متعدد زبانوں کی طرح سرائیکی شعری ادب سے بھی آ جڑتی ہیں۔ سرائیکی نعت کے ابتدائی رنگ کے حوالے سے دیکھا جائے تو "نور نامہ" کو اہم ترین رنگ کہا جا سکتا ہے۔ نور نامہ ایک طویل نظم ہے جو لگ بھگ ایک ہزار برس سے سرائیکی وسیب میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ اس نظم میں "نور" کا لفظ تسلسل سے استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا نام "نور نامہ" پڑ گیا۔ نور نامہ میں نبی اکرمؐ کے اعلیٰ رتبہ کے ساتھ ساتھ تخلیق کائنات کا ذکر پایا جاتا ہے اور سب سے طویل تذکرہ آپ کی تخلیق کے بارے میں ہے(۱)۔ نور نامہ کے سلسلے میں "نسخہ ملا" اور "نسخہ مراد" کے نام خاص طور پر معروف ہیں۔ یہ دونوں نسخے شوکت مغل کی تصحیح، ترتیب اور تعریب کے حوالے سے اشاعت مکرر کے طور پر طباعت کے مراحل طے کر چکے ہیں۔

میر حسان الحیدری "نسخہ ملا" کی قدامت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "قدامت کے لحاظ سے مستقل سرائیکی تصانیف میں "نور نامہ" کو شرف اولیت حاصل ہے۔ یہ ۱۱۰۷ء۔ ۱۱۱۱ء/۵۰۱ھ۔ ۵۰۵ھ کے درمیان کی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف حضرت ملا ایک اچھے قادر الکلام شاعر نظر آتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے ادبی سرمایہ سے اس کا تقابل کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے۔"(۲)

نور نامہ کے علاوہ معراج نامہ، حلیہ نامہ، درود نامہ، تاریخ نامہ اور مولود شریف کو نعت کی قدیمی شکل کہا جا سکتا ہے۔

مولود شریف کے بارے میں محمد حیات چغتائی لکھتے ہیں:

> "سرائیکی میں نعت بطور صنف کے بہت بعد میں آئی ہے۔ عہد قدیم سے سرائیکی میں مولود شریف لکھے جاتے تھے اور مساجد یا مذہبی مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے۔ مولود شریف کے کئی کتابچے شائع ہوئے ہیں جن میں

CamScanner

گلشن، جلوہ طور، در یار رسولؐ، سلطان عربؐ، سرکار دو عالمؐ، سفینہ عرب، نوائے فیض، کلام فیض، فیض مدینہ، فیض مجتبےٰ، فیض سیرا، فیض عرب، فیض حبیبؐ، مدینے دے موتی اور دیگر متعدد تخلیقات شامل ہیں

امیر مدنی کی اصل پہچان کی ان کا نعتیہ مجموعہ "مدنی نگیں سلطان" ہے جسے وزارت مذہبی امور حکومت پاکستان کی جانب سے سیرت ایوارڈ کا اعزاز حاصل ہے۔ ڈیرہ غازی خان کے قلم کار محمد رمضان طالب کا نعتیہ کلام "پھنوار" کے عنوان سے سامنے آیا جسے ادبی حلقوں میں پذیرائی ملی۔ محمد اسلم مجتبیٰ کا نعتیہ مجموعہ "گلشن سرکارؐ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس میں نعت کے مختلف رنگوں میں مولود شریف اور قطعات بھی پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں "شان ذوالجلال" کے عنوان سے ان کا حمدیہ کلام بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ اقبال حسین بھٹہ کا کلام "مکہ مدینے دا"، ایم بی اشرف کی تخلیق "کونین دا سہرا"، نواز یزدانی کی تخلیقات "سنگ مرمر" اور "خوشبو"، دلشاد کلانچوی کی "نعتیہ سی حرفی"، بخت فقیر کا کلام "رحمت دی ذات"، نور محمد کہتر کے مولود شریف بعنوان "کلام کہتر"، خدا بخش اظہر کا نعتیہ کلام "دیوان اظہر"، غلام محمد واصف کا "دیوان واصف"، گلشاد قادری کا نعتیہ مجموعہ "مدنی دے سہرے"، حافظ رسول بخش ماخودی کی کتابیں "مٹھے مدنی دیاں نعتاں" اور "پاک نبیؐ دیاں نعتاں"، ریاض حسین ادم کا مجموعہ "نورونی بارش"، مولانا بشیر احمد منظور سعیدی کی کتاب "مصطفیٰ میم محمدؐ"، خادم عارش بخاری کی کتاب "مدحت مصطفیٰؐ"، الطاف حسین پرواز قیصرانی کا نعتیہ مجموعہ "ذات"، جمشید کلانچوی کی تحریر "رحمت دی چھاں"، حمد، نعت اور منقبت کی نمائندگی کرنے والا یقین محمد ساجد جنگوانی کا کلام "کلیات ساجد"، منظیر حسین شہباز کی تخلیق "صفا محمدؐ"، خادم حسین تگی کی کتاب "کھیادیا"، شبیر شوکت سعیدی کی نعتیہ تخلیق "ذو جگ دا والی"، عارش گیلانی کا دینی ادب پر مشتمل کلام "رب دیاں جھاناں" اور مقبول ذکی مقبول کی مذہبی شاعری "سجدہ" میں نعت کے مختلف رنگ اجاگر ہوئے ہیں۔ حمید الفت ملغانی (راقم) کا مجموعہ کلام "میم دے اولے" اسماء النبیؐ کے حوالے سے معرا نظموں پر مشتمل ہے۔ علامہ اللہ بخش نیر کا نعتیہ مجموعہ "نعمت القادر المعروف کلام نیر" ان کے فرزند صاحبزادہ احمد رضا اعظمی نیر الباروی نے ۲۰۲۲ء میں ترتیب دے کر شائع کیا۔

نعت کے تخلیقی مجموعوں کے علاوہ مرتبہ کتب بھی شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں بہاول پور سے تعلق رکھنے والے حافظ بشیر احمد منظور سعیدی اور رحیم یار خان کے نعت خواں حافظ غلام شبیر کھوکھر کی مرتب کردہ کتب خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔

CamScanner

مرثیہ نگاری

مرثیہ عربی زبان کے لفظ "رثا" سے مشتق ہے جس کے معنی "وفات پا جانے والے کی تعریف و توصیف" کے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ مرثیہ کا لفظ شہدائے کربلا کے واقعات کے تذکرے کے لیے مخصوص ہو گیا۔ ویسے تو پاکستان کی ہر زبان میں مرثیہ تحریر کیا جاتا ہے لیکن سرائیکی زبان میں لکھا جانے والا مرثیہ سب سے زیادہ معروف ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرائیکی مرثیہ میں شائع ہونے والا ادب بھی انفرادیت کا حامل ہے۔

کیفی جام پوری کے مطابق:

"ہیئت کے اعتبار سے سرائیکی مرثیہ کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ اردو مرثیہ کے بر عکس یہ عربی اور فارسی کی تقلید سے یکسر آزاد ہے۔۔۔ سرائیکی زبان کا مرثیہ گو شاعر حمد خدا، نعت نبیؐ اور منقبت علیؑ سے مرثیہ کی ابتدا کرتا ہے۔ اس کے بعد واقعہ بیان کرتا ہے جس میں رجز بھی ہوتا ہے اور جنگ کا نقشہ بھی کھینچا جاتا ہے۔"(۵)

سرائیکی کے معروف شعرا میں غلام سکندر غلام، اللہ بخش فدوی، سید اکبر شاہ، مولوی فیروز الدین، ذوالفقار علی شیرازی، سید علی شاہ، نبی بخش مضطر، عاشق ملتانی، غلام حیدر فدا، بہار ملتانی، امام علی شاہ شفیق، حسن بخش کمتر، نبی بخش شوق، سید مداح حسین شاہ، نوران گدائی، مخدوم نوبہار، غلام حسین تائب، بشیر تائب، بہار ملتانی، حسرت ملتانی اور زاہد حسین راز کے نام خاص طور پر مرثیہ گو کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مظفر مہدی نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں ساتویں صدی عیسوی کے بلند پایہ عربی شاعر ہارون بن موسیٰ ملتانی کو عظیم مرثیہ گو شاعر کے حوالے سے متعارف کرایا جس نے عربی کے علاوہ سرائیکی زبان میں بھی مرثیہ لکھا(۶)

سرائیکی رثائی شاعری کی اشاعت کا سلسلہ چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں شروع ہوا۔ ان میں سے متعدد کتابچے بار بار شائع ہوتے رہے ہیں۔ کتابچوں کی صورت میں شائع ہونے والی شاعری کا یہ سلسلہ قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا۔ سرائیکی ادبی مجلس بہاول پور کی اشاعت کے طور پر سامنے آنے والی سطیر الا شاری کی شاعری "صابر چتر علیؑ دا" اہم کتابی سلسلے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی

۔ سفیر لاشاری کا مجموعہ "مس لہو کا قطرہ" بھی سرائیکی رثائی ادب کے فروغ میں اہم مثال ہے۔ سرور کربلا
ئی کی کتاب "نخلے لوک سناں دے" اور عزیز شاہد کی تحقیق "سلسلے سلونی دے" سرائیکی مرثیہ نگاری میں
اہم اضافہ کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ تسنیم ایس کی کتاب "وکھرے ڈکھ حسین دے" بزم سوز بخاری کی کتب "
حسین شہید یزید پلیدا" اور "مدینہ نجف کربلا" کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ غلام محمد محمود تونسوی کی کتاب "حسینی
تبرکات" میں مرثیہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مصطفیٰ خادم کے رثائی مجموعہ "پنج تنی" میں شہدائے اہل
بیت سے عقیدت کے پھول نچھاور کیے گئے۔ ارشاد ڈیروی نے "رت ریت رنگا"، "چودھار کربلا ہے"، "
نماز غم دے" اور "ا ان لٹی ہوئی شام" کے عنوان سے مرثیہ گوئی کا حق ادا کیا۔ نواز بزدار کی تحقیق "حسینؑ
سب دا"، زاہد جعفری کے [illegible] نوحے بعنوان "قریب کربلا"، افضل ندیم افضل کے مجموعے "حرف حرف
کربلا" اور "مظلوم کربلا" واقعہ کربلا کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ معروف نعت گو شاعر فیض محمد سند عزی کی کتب
"شام دے سفر" اور "داستان کربلا" مرثیہ کی صنف میں اہمیت کی حامل ہیں۔ ارشاد جھنڈیر کی کتاب "
رموز مودت" سرائیکی مرثیہ کے حوالے سے اہم سنگ میل ہے۔ صفدر کربلائی کی تحقیق "بحرین دے موتی
" میں قصیدے، نوحے اور مرثیے شامل ہیں۔ غلام اکبر لغاری کی کتاب "حسینؑ یاد آندے"، بشیر جاوید کا
مجموعہ "کوثر کنارے"، اشرف حسین باقر کی کاوش "قصے پال"، زوار حسین زوار کی کتاب "حسینؑ میڈا"
اور سعیل بلوچ کے کلام "قرآن تے حسینؑ" میں حسینیت کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ سید غلام حسن شاہ
تائب کی کتاب "ثنائے مظہر العجائب" اور غلام سکندر غلام کے کلیات "لیر کتیر تھیے" کو صفدر کربلائی کی
ترتیب و پیش کش سے سامنے لایا گیا۔ نیز مرثیہ کے چار قدیم شعرا سید علی شاہ، مولوی نذر حسین ترک، مو
لوی غلام علی لنگاہ اور شہزادہ خادم حسین کے کلام کو بھی یک جا کر کے "دبستان کھچی" کے عنوان سے صفدر کر
بلائی نے پیش کیا۔ امام علی شاہ شفیق کے کلام کو اکٹھا کر کے ان کے پوتے سید کرامت علی شاہ کاظمی نے
"کلیات شفیق" کے عنوان سے ترتیب دے کر پیش کیا۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے شعرا سید جعفر حسین
رایت اور سید صادق حسین جرأت کی مشترکہ تصنیف "فانوس: رایت و جرأت" کے عنوان سے سامنے آئی
۔ فرید ساجد لغاری نے "مناجات معصومینؑ" کے عنوان سے آئمہ سے منسوب دعاؤں کو منظوم سرائیکی
ترجمے کے طور پر پیش کیا۔

حوالہ جات

۱۔ شوکت مغل (مرتب)، "نور نامہ"، ملتان: جھوک پبلشرز، ۲۰۰۱ء، بیس ورق

۲۔ حسان الحیدری، میر، سرائیکی ادب، مشمولہ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" چودھویں جلد، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء، ص ۲۷۰

۳۔ محمد حیات چغتائی، اُردو نعت کی تین جہات، بہاول پور: مکتبہ الہام، ۲۰۰۶ء، ص ۸۵

۴۔ سجاد حیدر پرویز، ڈاکٹر، "مختصر تاریخ زبان و ادب سرائیکی"، اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان، طبع چہارم ۲۰۱۲ء، ص ۱۳

۵۔ کیفی جام پوری، "سرائیکی شاعری"، ملتان: بزم ثقافت، ۱۹۶۸ء، ص ۹۱

۶۔ مظفر مہدی، ڈاکٹر، "سرائیکی مرثیہ: حضرت شاہ شمس تبریز سے گل محمد عاشق ملتانی"، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، قائد اعظم یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۷۳

CamScanner

نثری دینی ادب

قرآن و حدیث

قرآن مجید کے جزوی سرائیکی تراجم کا سلسلہ ۱۳۱۳ھ میں شروع ہوا۔ یہ پہلے پارہ کا ترجمہ مولوی احمد بخش نے کیا تھا بعد ازاں متعدد تراجم مطبوعہ اور غیر مطبوعہ طور پر سامنے آئے جن کی تفصیل ڈاکٹر سید مقبول حسن گیلانی کے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں "قرآن مجید کے جزوی تراجم کا چارٹ" میں ہے:

نمبر شمار	عنوان	مترجم	سن طباعت
۱	پارہ الم	مولوی احمد بخش	۱۳۱۳ھ
۲	پارہ اول مترجم بزبان ملتانی	مولانا قمر الدین ساہر ملتانی	۱۳۳۲ھ
۳	عم یتساءلون، الم و ترجمہ ملتانی زبان میں	عبد الوہاب ملتانی	۱۳۵۹ھ
۴	تقریباً القرآن [پارہ ۲۹، ۳۰]	نور احمد سیال	۱۹۷۵ء
۵	دلشاد یہ تفسیر سورۃ الفاتحہ	دلشاد کلانچوی	۱۹۸۳ء
۶	الحمد للہ	ڈاکٹر مہر عبد الحق	۱۹۸۶ء
۷	فرید التفاسیر یعنی تفسیر سرائیکی	علامہ محمد اعظم سعیدی	۱۹۸۸ء
۸	سیپارہ ۳۰ عم، متعدد سورتیں اور قرآنی آیات	محمد رمضان طالب	۲۰۰۱ء
۹	قرآن کریم دی یارھاں سورتاں دا سرائیکی ترجمہ	حافظ افتخار احمد شاہد عباسی	۲۰۰۶ء، غیر مطبوعہ
۱۰	قرآن کریم دا سرائیکی ترجمہ منظوم	عبد الوہاب عباسی	۱۹۹۸ء، غیر مطبوعہ
۱۱	قرآنی سورتیں دا سرائیکی ترجمہ منظوم	غلام رضا سیدا بھٹی	۲۰۰۷ء، غیر مطبوعہ
۱۲	یارھاں سورتاں سرائیکی ترجمے نال	مولانا حفیظ الرحمن حفیظ	۱۳۷۱ھ
۱۳	قرآن کریم دیاں چوں ویاں آیتاں	خان محمد خان ملتانی	۱۹۸۹ء
۱۴	سو گل سو جھال، ترتیب و ترجمہ، سو گل تحریں	محمد رمضان طالب	۲۰۰۳ء

درج بالا جزوی تراجم کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کے مکمل تراجم کی جانب بھی قلم کاروں کی تو

MirZaheer Abass Rustmani

CamScanner

جو مبذول ہوئی جس کے باعث ۱۳۷۲ھ میں محمد حفیظ الرحمٰن حفیظ کا مکمل ترجمہ اولین ترجمے کے طور پر شائع ہوا۔ اس کے بعد متعدد تراجم مطبوعہ اور غیر مطبوعہ طور پر سامنے آئے جن کی تفصیل ڈاکٹر سید مقبول حسن گیلانی کے دیے گئے چارٹ میں کچھ یوں دی گئی ہے:

نمبر شمار	عنوان	مترجم	سن طباعت
۱	قرآن مجید مترجم	محمد حفیظ الرحمٰن حفیظ	۱۳۷۲ھ
۲	قرآن مجید ترجمہ زبان سرائیکی	ڈاکٹر مہر عبدالحق	۱۴۰۳ھ
۳	ترجمہ سرائیکی تفسیر حسینی المعروف سوغات نظامی	محمد نظام الدین نظامی	۱۹۹۵ء
۴	قرآن مجید سرائیکی ترجمے نال	خان محمد رکانی، رفیق احمد بھلر کانی	۱۹۹۸ء
۵	تفسیر الاکلیل بزبان سرائیکی	غلام محمد چاچڑانی	۱۹۹۶ء غیر مطبوعہ
۶	سوکھے سرائیکی ترجمے نال قرآن شریف	دلشاد کلانچوی	۲۰۰۰ء
۷	المرجان: قرآن پاک دا سرائیکی ترجمہ	مفتی عبدالستار سعیدی	۲۰۰۱ء غیر مطبوعہ
۸	تفسیر القرآن المعروف سوچی تفسیر	ڈاکٹر محمد صدیق شاکر	۲۰۰۵ء
۹	نورالایمان: قرآن پاک دا سرائیکی ترجمہ	ملک ریاض شاہد چڑ	۲۰۰۸ء غیر مطبوعہ

مندرجہ بالا مکمل تراجم میں سے ڈاکٹر مہر عبدالحق کا ترجمہ پاکستان قومی ہجرہ کونسل کے خصوصی اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہوا۔ دلشاد کلانچوی کے مکمل ترجمے سے قبل ابتدائی چھ پارے ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۲ء جزوی طور پر شائع ہوئے اور بعد ازاں پہلی بار ۱۴۱۳ھ بمطابق ۱۹۹۳ء میں مکمل ترجمہ شائع ہوا جب کہ متذکرہ چارٹ میں شامل جھوک پبلشرز کا نسخہ اشاعت دوم کے طور پر سامنے آیا۔ جہاں تک ڈاکٹر محمد صدیق شاکر کی تفسیر کا تعلق ہے تو ۲۰۰۵ء میں شائع ہونے والی پہلی جلد قرآن مجید کی پہلی منزل کی نمائندگی کرتی ہے اور باقی چھ جلدیں ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئیں اور اس طرح سات منازل پر مشتمل تفسیر کی سات ضخیم جلدیں سرائیکی ادب میں اہم اضافہ ہیں۔ اس تفسیر کی ہر جلد کے آخر میں موضوعات کے حوالے سے اشاریہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ محمد رمضان طالب کی کتاب "قرآن پاک دیاں جاگھی آیتاں" کے علاوہ فیض بلوچ کی تحریر "فن تجوید" میں قرآن پاک کو تجوید اور قرات ساتھ پڑھنے کا طریقہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

جہاں تک احادیث کے تراجم کا تعلق ہے تو کتابی شکل میں سامنے آنے والے مواد میں سے

۱۹۷۵ء میں شائع ہونے والے دلشاد کلانچوی کے ترجمہ و تشریح بعنوان "چالیہہ حدیثاں" کو اس سلسلے کی ابتدائی دستاویز کہا جا سکتا ہے۔ محمد رمضان طالب کی کاوش کے طور پر سامنے آنے والے کتابچوں میں "مشکوٰۃ شریف وچوں ۲۰۰ حدیثاں"، "مشکوٰۃ شریف وچ ۱۰۰ حدیثاں" اور "چالھی حدیثاں" (منظوم ترجمہ اور نثری شرح) کے علاوہ مولانا احمد سعید دہلوی کی کتاب "احادیث قدسیہ" کو جمشید کلانچوی اعوان کی جانب سے کیے جانے والے سرائیکی ترجمے "اللہ دیاں گالھیں" نمونے کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں جب کہ ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز نے اس سلسلے کی خان محمد سکانی کی کتاب "چوڑویاں حدیثاں" کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ (۳)

سیرت نگاری

سرائیکی نثر کے مذہبی موضوعات میں سیرت نگاری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اس موضوع کی ابتدائی اور غیر مطبوعہ کاوش کے بارے میں کیفی جام پوری نے ۱۹۷۰ء میں قلم کار نبی بخش شوق سے ایک ملاقات کے حوالے سے لکھا ہے:

> "عاشق (عاشق ملتانی) کے مشہور تلامذہ میں ان کو اولیت کا فخر حاصل ہے اور اس پر ان کو ناز ہے۔ سیرت رسولؐ، شان نبوت خصوصاً ذکر معراج ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ان کے مراثی کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سرائیکی نثر میں سیرت رسول مقبول لکھ رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے ۵ھ تک کے واقعات پانسو صفحات میں لکھے ہیں۔" (۴)

بعد ازاں اسی قسم کا ایک حوالہ میر حسان الحیدری کی تحریر میں بھی ملتا ہے:

> "حاجی نبی بخش شوق (از ۱۹۶۹ء) بھی سرائیکی نثر میں نام پیدا کر رہے ہیں۔ آپ نے سیرت رسول لکھنا شروع کی ہے۔ اور سنہ پانچ ہجری تک کے واقعات پانسو صفحات میں قلمبند کیے ہیں۔" (۵)

سیرت نگاری کو باقاعدہ کتب کے حوالے سے دیکھا جائے تو ۷۰ء کی دہائی میں دلشاد کلانچوی کی سلسلہ وار تحریریں "جڈاں رسول کریمؐ بال ہن"، "جڈاں رسول کریمؐ جوان ہن" اور "جڈاں رسول کریمؐ کوں نبوت ملی" کتابی شکل میں شائع ہو کر سامنے آئیں۔ بعد ازاں ڈاکٹر مہر عبدالحق کی کتاب "کونین دا والی" کی اشاعت سیرت نگاری کی جانب اہم قدم تھا کیوں کہ یہ کتاب مختصر انداز میں سیرت رسولؐ کے

مختلف پہلو اجاگر کرتی ہے۔ علاوہ ازیں محمد شفیع احسانی کی کتاب ''آمنہ دا لعل'' بھی ان ابتدائی کتب میں شامل ہے جو سیرت النبیؐ کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہ کتاب تیس برس بعد ۲۰۱۷ء میں تراجم و اضافے کے باعث ضخیم ہونے کے ساتھ ساتھ نئے روپ کے طور پر سامنے آئی۔

سجاد حیدر پرویز کی کتاب ''مدنی سخا من نمانڑاں'' کو اس موضوع کے حوالے سے وفاقی وزارت مذہبی امور کی جانب سے ہجرہ ایوارڈ کا اعزاز حاصل ہوا۔ محمد رمضان طالب کی کتاب ''محبوب رب دا'' آسان اور عام فہم زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ جب کہ محمد رمضان طالب کی کتاب ''سوہنے سئیں دے سوہنے چٹھے'' میں بادشاہوں، گورنروں، صحابہ کرامؓ اور دیگر شخصیات کو بھیجے گئے پچاس سے زائد خطوط شامل ہیں۔ آپؐ کے خطوط اور پیغامات کے حوالے سے ان کی کتاب ''مدنی سئیں دے سوہنے چٹھے'' بھی سامنے آ چکی ہے جس میں کچھ خطوط کے عکس بھی دیے گئے ہیں۔ محمد رمضان صاحب کتاب ''سوہنا مکمل سیرت'' میں حیات طیبہ میں عرب کی تاریخ، خاندان عبدالمطلب، آپؐ کی تشریف آوری، کفار کی مخالفت، ہجرت، غزوات اور دیگر موضوعات شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی تحریر ''سوہنا جبل خیراں'' کو بھی سیرت نگاری کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جس میں صحابہ کرامؓ کے سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد صدیق شاکر کا نام مذہبی موضوعات خصوصاً سیرت النبیؐ کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ''سئیں سوہنیں دی سیرت''، ''ذکر جی آ پڑیں تے اوپریں ورق''، ''سئیں سوہنیں دا ذکر''، (رسولاں وچ)، ''سئیں سوہنیں دا خلق''، ''سوہنیں سوہنیں دا کمال''، ''سئیں سوہنیں دا جلال'' اور ''سئیں سوہنیں دا جمال'' کے عنوانات سے سامنے آنے والی ضخیم کتب سرائیکی میں سیرت نگاری کے بارے میں اہم دستاویزات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے متعدد کتب پر وفاقی وزارت مذہبی امور کا ہجرہ ایوارڈ بھی دیا جا چکا ہے۔

مسرت کلانچوی کی کتاب ''کملی مدنی'' میں حیات طیبہ کو چالیس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے ''خواجہ فرید ایوارڈ'' ملنے کا اعزاز حاصل ہے۔ احمد بخش ملانہ کی کتاب ''عربی ڈھولا'' میں آپؐ کی ولادت سے وصال تک کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ مختصر اور سادہ اسلوب میں تحریر کی گئی یہ کتاب سرائیکی ریسرچ سنٹر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی اشاعت کے طور پر سامنے آئی۔

محبوب تابش کی اہم اور ضخیم کتاب "میڈوں شالی" سیرت نگاری کی اہم کتب میں شامل ہے۔
اس کتاب میں عرب کی تاریخ سے آپ کی سیرت تک کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ارشاد احمر جعفری کی کتب "سوجھلا" اور "اول نور" میں نبی پاکؐ کی ولادت سے وصال تک کے اہم واقعات کو مختصر اور عام فہم انداز میں پیش کیا گیا۔

کوثر ثمرین کی کتاب "خوشبو بھریاں چھاواں" سرائیکی زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ جس میں امہات المومنینؓ کے احوال کو قلم بند کیا گیا ہے۔ امہات المومنینؓ کے تعارف اور فضائل سے پہلے "سوہناں دیاں واں" اور "نبی پاکؐ دا آنگن گھر آلیں نال حسن سلوک" جیسے عنوانات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سیرت نبویؐ اور صحابہ کرامؓ کے حوالے سے سوال و جواب کے انداز میں سامنے آنے والی تحریر بعنوان "لعل تے ہیرے" ملتان سے شائع ہوئی جسے اسلم بھٹی نے مرتب کر کے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اسی انداز کی کتاب "سوجھل نجراں" محمد رمضان صاحب کی پیش کش کے طور پر سامنے آ چکی ہے۔

دیگر موضوعات

"قرآن و حدیث" اور "سیرت نبویؐ" کے علاوہ دینی ادب کے متعدد موضوعات سامنے آئے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں انجیل مقدس کے تراجم مختلف زبانوں میں سامنے آئے۔ تو اس سلسلے کے سرائیکی تراجم ۱۸۹۸ء میں مشن پریس امرت سر سے چھپ کر پنجاب ریلیجس سوسائٹی لاہور سے شائع ہوئے۔ "انجیل مقدس متی"، "انجیل مقدس مرقس"، "انجیل مقدس یوحنا" اور "انجیل مقدس لوقا" کے یہ تراجم نایاب ہو جانے کے باعث ۲۰۱۷ء میں شوکت مغل نے "انجیل مقدس کے سرائیکی ترجمے" کے عنوان سے فوٹو سٹیٹ کے طور پر محدود تعداد میں یکجا کر کے پیش کیے تاکہ نصابی ضرورت کو پورا کیا جا سکے۔ اس مرتبہ مجموعے کا عنوان، ضابطے کا صفحہ اور انجیل کے سرائیکی تراجم کی تاریخ کے حوالے سے پیش کیا گیا مقدمہ نئے سرے سے سامنے لانے کی کوشش کی گئی جب کہ انجیل کے متذکرہ چاروں نسخوں کو فوٹو کاپی کے طور پر پیش کیا گیا۔

اسلامی فقہ کے بارے میں لکھی جانے والی کتاب "یکی روٹی" مدتوں سے معروف ہے جسے دین دار گھرانوں میں بچپن سے یاد کرانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس میں روزمرہ کے اہم مسائل سوال و جواب کی شکل میں ترتیب دیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر شوکت مغل کی پیش کش کے

طور پر ۲۰۰۲ء میں اسے اشاعت مکرر کے طور پر سامنے لایا گیا۔ محمد رمضان طالب کی متعدد کتب دینی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کتب میں "عمرہ تے حج"، "نبی سئیں دی نماز"، "دعائیں پناہیں"، "مکی مادر رمضان"، "رمضان والقرآن شافع المیزان" اور "ارکان اسلام" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

قدامتانی اور اکرم ریگھا کا ترجمہ "نماز محمدی"، اخلاق احمد سعیدی کا "کاوش" "زاد نبی" اور منظور احمد اعوان کی کتاب "وڈے لوک وڈیاں گالھیں" جو اقوال انبیاء کرام، صحابہ کرامؓ، اولیاء اللہ اور بزرگان دین، دینی موضوعات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ دلیر سوہائی نے عربی زبان کی "دعا کمیل" کو سرائیکی روپ دیا۔ جمشید کمتر بگٹی اعوان کی کتاب "شرح الاسماء الحسنیٰ مع ورد و وظائف" میں اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کی تشریح کے علاوہ ہر نام کے وظائف بھی شامل کیے گئے ہیں۔ علامہ خورشید احمد فیضی کی سرائیکی تقاریر کے مجموعہ "خطبات خورشید ملت" کی تین جلدیں چھپ کر سامنے آ چکی ہیں۔ ڈاکٹر سید مقبول حسن گیلانی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "قرآن حکیم کے سرائیکی تراجم" کے عنوان سے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی اشاعت کے طور پر سامنے آ چکا ہے۔ جس میں قرآن مجید کے مکمل تراجم، جزوی تراجم اور سرائیکی میں کیے جانے والے تراجم کے تقابل کو شامل کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مقبول حسن گیلانی، ڈاکٹر پروفیسر سید، قرآن حکیم کے سرائیکی تراجم، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۲ء، ص ۲۰۹

۲۔ مقبول حسن گیلانی، ڈاکٹر پروفیسر سید، قرآن حکیم کے سرائیکی تراجم، ص ۱۰۱

۳۔ سجاد حیدر پرویز، ڈاکٹر، مختصر تاریخ زبان و ادب: سرائیکی، اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان، طبع چہارم ۲۰۱۶ء، ص ۳۶۲

۴۔ کیفی جامپوری، سرائیکی شاعری، ملتان: بزم ثقافت، ۱۹۶۸ء، ص ۲۲۲-۲۲۳

۵۔ حسان الحیدری، میر، سرائیکی ادب، مشمولہ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، چودھویں جلد، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء، ص ۳۳۲

CS CamScanner

شعری اصناف

CamScanner

کافی

ہر زبان میں کلاسیکی شاعری کی کچھ اصطلاحات انفرادیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو کافی کی اصطلاح سرائیکی شاعری کی خاص پہچان ہے۔ کافی کا رشتہ سرائیکی خطہ سے اس قدر قدیم ہے کہ بعض روایت کے مطابق یہ لوک گیت سے بھی پہلے کی صنف ہے کیونکہ سرائیکی لوک شاعری پر نظر دوڑائی جائے تو احساس ہوتا ہے کہ لوک گیتوں میں کافی کی روح شامل ہے۔

جہاں تک لفظ "کافی" کا تعلق ہے تو اسے عربی کے لفظ "قوافی" (کلام، بیت، شعر) کی ایک شکل کہا جاتا ہے۔ کافی کے مطلع میں ایک مصرع یا ایک شعر پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد عموماً دو سے چھ مصرعے ملا کر ایک بند ہوتا ہے اور ہر بند کا آخری مصرع مطلع سے ہم قافیہ ہوتا ہے۔ کچھ کافیاں غزل کی ہیئت میں بھی ملتی ہیں۔

کافی تصوف کی جھولی میں پروان چڑھتی ہے اور اس میں محبت کا اظہار عورت کی جانب سے ملتا ہے۔ اسی کافی ہی کا اثر ہے کہ سرائیکی شعری ادب میں عام طور پر عورت کو محبت کی حیثیت حاصل رہی ہیں۔ کافی کے مختلف رنگوں میں عارفانہ رنگ کے ساتھ ساتھ عوامی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ عوامی استعارے اور زندگی کے متعدد رنگ کافی کی پہچان ہیں۔ کافی کے لیے ضروری ہے کہ اسے بلکے پھلکے سُر میں گایا جا سکے۔ کافی کے قدیم تصاری کافی تحریر کرتے ہوئے اس کا راگ بھی لکھا کرتے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کافی لکھنے والا راگ سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔

فرہنگ تلفظ میں "کافی" کی وضاحت یوں ملتی ہے:

"ایک غنائی صنف جس کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں، عموماً چھندوں یا چیتوں کی شکل میں عارفانہ کلام، نیز دوائی موسیقی کا ایک ٹھاٹھ، نیز راگ"(1)

سرائیکی کافی کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیا جائے تو اس کی ابتدا کے واضح ثبوت نہیں ملتے البتہ اس کی کڑیاں قدیم سے قدیم شاعری تک چلی جاتی ہیں۔ ہیئت اور مواد کے حوالے سے دیکھا جائے تو شاہ حسین کو کافی کا پہلا باقاعدہ شاعر کہا جاتا ہے۔

Mir Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

کلی جو م پوری کے مطابق سندھی زبان میں کافی کا ابتدائی نام "وائی" تھا اور یہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ایجاد بھی جاتی ہے۔ جنہوں نے سرائیکی میں بھی وائی کہی ہے۔ لیکن سرائیکی میں یہ صنف شاہ لطیف کی وائی سے پہلے رائج تھی اور "کافی" ہی کہلاتی تھی (۲)۔

حفیظ خان "کافی" کی جنم بھومی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "شواہد کے سیاق وسباق میں دیکھا جائے تو سرزمین ملتان ہی کافی کی جنم بھومی قرار پاتی ہے جہاں ملتانی (سرائیکی) زبان میں کہی گئی کافیاں نہ صرف سندھ تک پہنچیں بلکہ دہلی اور شمالی سندھ سے ہوتی ہوئی جنوبی ہند تک پہنچیں۔ ملتان میں سرائیکی کافی کے جنم لینے کے بارے میں تمام تر معلوم شواہد تیرھویں صدی عیسوی ہی سے متعلق ہیں۔" (۳)

حفیظ خان اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سرائیکی میں کافی کے دستیاب نمونے کے حوالے سے تحریر کرتے ہوئے شاہ شمس سبزواری کے گنان کو "کافی" کی ابتدائی شکل سے موسوم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اگر یہ کہا جائے کہ سرائیکی کافی کی اولین شہادت شاہ شمس سبزواری کے گنان ہیں تو پھر بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔۔۔ میرے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ سرائیکی میں شاہ شمس سبزواری کے گنان سے پہلے کافی کا وجود نہ ہو۔ ابتدائے زمانہ اور حملہ آوروں کی برپا کی گئی بربادی نے وادیٔ سندھ میں کچھ بھی دستاویزی اثاثہ باقی نہ چھوڑا کہ جس سے ماضی کی مسافتوں کو درست جوڑا جا سکتا۔ لیکن محققین کم از کم اس بات پر متفق ہیں کہ سرائیکی میں کافی گوئی کا ابتدائی دستیاب نمونہ شاہ شمس سبزواری کے گنان ہیں جو تیرھویں صدی عیسوی میں تخلیق ہوئے۔" (۳)

سرائیکی کافی گوئی میں شاہ حسین کو پہلا باقاعدہ شاعر کہا جاتا ہے۔ بلھے شاہ، چنل سرمست، روحل فقیر، منشی غلام حسین گامن ملتانی، حمل خان لغاری، بیدل فقیر اور حیدر شاہ سے ہوتے ہوئے سرائیکی کافی کی روایت خواجہ غلام فرید تک پہنچی۔ بے شک خواجہ فرید سرائیکی کافی کے بے تاج بادشاہ ہیں جنہوں نے شاعری میں کافی کو ہی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ خواجہ غلام فرید نے کافی کی صنف میں نئے نئے تجربات کر کے اسے اصول اور ثابت بنا دیا۔ مختلف بحروں کے اوزان اور ارکان میں جدت پیدا کی۔ موسیقی کے نئے

نئے سُر ایجاد کیے۔ کافی کو غزل کے پیرائے میں لکھنے کا رواج دیا۔ خلیل اللہ کی خوبصورتی، تکرار لفظی کا برتا
ؤ، چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بحر کا استعمال، منظر نگاری کا فن، عشق و محبت کے جذبات کا اظہار
ہر دی تحل، وہاں کی دیہاتی زندگی کا مکمل عکس اور خاص طور پر تصوف کے افکار کے ساتھ ساتھ عشق کے
تصور کو اہمیت دی جیسا کہ ایک کافی میں عشق کو منزل کا رہبر بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

تھکی ودیشاں ہے تا ئیں جیساں　　　جے ول دلساں کو غر تھیساں

گل وچ پا تم پریت مہار (۵)

میاں محمد بخش نوروز کی سرائیکی کافی پر نظر دوڑائی جائے تو احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے کافی
کی صنف کو نیا موڑ دیا ہے۔ اس دور میں کافی روحانی رنگ سے نکل کر عوامی رنگ میں رنگی ہوئی سامنے
آئے۔ اسی زمانے میں جندن ملتانی اور حاجی اللہ بخش خادم کی کافیاں بھی عارفانہ اور داخلی رنگ سے ہٹ
کر خارجی رنگ میں آتی ہیں۔

مولانا نصیر الدین خرم بہاول پوری نے سرائیکی کافی کو الگ پہچان دی۔ ان کے کلام میں جہاں
درد دل پایا جاتا ہے وہاں کلام کا منفرد اسلوب دل میں گھر کر جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

سرائیکی کافی کے شائع شدہ مجموعہ جات کے حوالے سے دیکھا جائے تو ۱۹ ویں صدی عیسوی
میں خواجہ غلام فرید کی "کافیاں"، "معدن عشق" اور ۲۰ ویں صدی کے شروع میں سامنے آنے والی فریدی
کافیاں "اسرار فریدی" خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ بعد ازاں "دیوان فرید" کے عنوان سے متعدد مرتبین
کے حوالے سے کلام فرید سامنے لایا گیا۔ خواجہ غلام فرید، شاہ ولایت اور خواجہ محمد یار کی مشترکہ کلام "مجموعہ
کافیاں و غزلیات" کے عنوان سے ملتان سے شائع کیا گیا۔ عاشق محمد کی کافیاں "دیوان رفیق العاشقین"
کمال خان کی تخلیق "کافیاں کمال خان" اور مستن خان ملتانی کا کلام "مجموعہ کافیاں" مسمٰی بہ "بحر فراق"
بھی انیسویں صدی کے آخر میں سامنے آنے والے کافیوں کے مجموعہ جات میں شامل ہیں۔

عاقل محمد جوگی کی کافیاں بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں شائع ہوئیں۔ جنھیں اس صدی
کے آخری عشرے (۱۹۹۲ء) میں ڈیرہ غازی خان کے ہاشم شیر خان نے مرتب کر کے دوبارہ شائع کرایا
۔ شاہ ولایت کا کلام "گنج عرفانی دیوان لاثانی"، اللہ ڈتہ ذوقی کا مجموعہ "مجاز الفراق" اور محمد بخش نوروز کی
کتاب "شعلہ دل سوز" کی دو جلدیں بھی بیسویں صدی کے ربع اول میں شائع ہونے والی کافیوں کی
اہم مثالیں ہیں۔ علاوہ ازیں شمس الدین کا مجموعہ "کافیاں بحر فراق"، عبدالغفور طالب کا "مجموعہ کافیاں و

کا شعری مجموعہ "نیل کنٹھ"، مسلمان سہو کا مجموعہ کلام "کن توں پہلے" اور سلیم شہزاد کی تخلیق "وڈیریں لڑا شیر" جدید کافی کے اہم نمونے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شان الحق حقی، "فرہنگ تلفظ"، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲ء، ص ۷۵۳

۲۔ کیفی جامپوری، "سرائیکی شاعری"، ملتان: بزم ثقافت، ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۵

۳۔ حفیظ خان، "کافی سندھ وادی کی شعوری تاریخ"، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۲ء، ص ۸۳

۴۔ حفیظ خان، "کافی: سندھ وادی کی شعوری تاریخ"، ص ۷۴-۷۵

۵۔ اقبال سوکڑی، "جھوک دے ہار"، ڈیرہ غازی خان: دبستان سحر، بار سوم ۱۹۹۲ء، ص ۱۱

۶۔ رفعت عباس، "عشق اساں کیں جا گیا"، ملتان: کتاب نگر، ۲۰۰۵ء، ص ۸

CamScanner

ڈوہڑہ

سرائیکی شاعری میں ایسی تمام اصناف موجود ہیں جو دورِ حاضر میں دیگر پاکستانی زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن سرائیکی شاعری کی کچھ اصناف ہر زبان کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ ان شعری اصناف میں "ڈوہڑہ" بھی ایک ایسی صنف ہے جسے سرائیکی زبان کی خاص پہچان کہا جا سکتا ہے۔

کیفی جام پوری اس بات کی تصدیق کچھ یوں کرتے ہیں:

"یوں تو اس زبان میں شاعری کی ہر وہ صنف پائی جاتی ہے جو اردو اور فارسی میں مستعمل اور مروج ہے مثلاً غزل، مثنوی، قصیدہ، قطع بند، مسدس، مخمس وغیرہ مگر ان اصناف نے بعد میں رواج پایا۔ صرف ڈوہڑہ اور کافی ایسی دو اصناف ہیں جو اس زبان میں قدیم چلی آتی ہیں۔"(۱)

ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر "ڈوہڑہ" کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی ہیئت، معانی اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ڈوہڑہ کافی کی طرح سرائیکی زبان کی بہت ہی مقبول اور قدیم صنفِ سخن ہے۔ ڈوہڑے میں عموماً چار مصرعے یعنی دو بیت شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے اسے ڈوہڑہ یعنی ڈوڑا (دوگنا) کہا گیا۔ ڈوہڑہ صرف چار مصرعوں تک محدود نہیں رہا بلکہ چھ مصرعے کے ڈوہڑے بھی بے شمار لکھے گئے ہیں۔ سرائیکی ڈوہڑے میں سوائی یعنی مستزاد کا بھی رواج ملتا ہے۔ اس صنفِ سخن کا بیت، بند، بحر اور سی حرفی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ڈوہڑے کی ابتدائی صورت بیت تھی۔ یہ ڈوڑا (دوگنا) ہو کر ڈوہڑہ بنا۔ ڈوہڑے سے بند اور بحر وجود میں آئے اور اسی طرح سی حرفی میں حروف کی ترتیب سے ڈوہڑے پابندِ تحریر ہوتے ہیں۔"(۲)

عہدِ موجود میں ڈوہڑہ کو چار مصرعوں کا پابند سمجھا جاتا ہے جس کے باعث کچھ لوگ ڈوہڑہ اور رباعی کی اصناف کو ایک ہی صنف تصور کرتے ہیں۔ اگر موضوع کی مناسبت سے دیکھا جائے تو ضرور ملتے

Mir Zaheer Abass Rustmani

جیسے محسوس ہوتے ہیں لیکن ہیت کے حوالے سے بہت سا فرق ہے۔ رباعی کا تیسرا مصرع ہم قافیہ نہیں ہوتا لیکن ڈوہڑہ کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں عروضی حوالے سے بھی رباعی اور ڈوہڑہ کے اوزان مختلف ہیں۔ رباعی ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس کے مخصوص اوزان اس قدر مشکل ہیں کہ ہر شاعر اس پر طبع آزمائی نہیں کر سکتا۔ جب کہ سرائیکی شاعری میں ڈوہڑہ کی صنف سے اکثر شعرا شاعری کی مشق شروع کرتے ہیں۔ سرائیکی ڈوہڑہ کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو یہ روایت اس قدر قدیم ہے کہ لوک ادب میں بھی متعدد ڈوہڑے موجود ہیں۔

ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر کی تحقیق کے مطابق ساتویں صدی ہجری میں ڈوہڑہ کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں، جب حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی نے اپنے خط میں حضرت مخدوم حمید الدین حاکم کو ایک ڈوہڑہ لکھ کر بھیجا اور اس کے جواب میں مخدوم حاکم نے بھی ڈوہڑہ تحریر کیا اور یہ دونوں ڈوہڑے محفوظ بھی ہیں۔ ڈوہڑہ کی صنف کا باقاعدہ طور پر حضرت سلطان باہو نے آغاز کیا جن کی سی حرفی ڈوہڑہ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ بعد ازاں سرائیکی زبان کے معروف شعرا علی حیدر ملتانی، لطف علی اور بچل سرمست نے اس صنف کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا (۳) جب کہ ابتدائی قلم کاروں میں بیدل سندھی، جمل خان لغاری، خیر شاہ اور خوشدل کے نام ڈوہڑہ کی صنف میں خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ علاوہ ازیں محمد بخش نوروز، جان محمد گداز، خرم بہاولپوری، احمد یار اچوی، یتیم جتوئی، شاکر تونسوی، نور محمد سائل، فیض محمد دلچسپ اور جانباز جتوئی جیسے شعرا نے ڈوہڑہ کی صنف میں کمال حاصل کیا۔

اکیسویں صدی کے قلم کاروں میں احمد خان طارق، شاکر شجاعبادی، اقبال سوکڑی، سرور کربلائی، منیر اشاروی، شفقت بزدار، مصطفیٰ خادم، عباس ملک، مشتاق سبقت، شاکر مہروی، امداد اللہ امداد، سیف اللہ سیفل، عبدالرشید اختر، فضل سوکڑی اور دیگر متعدد شعرا ڈوہڑہ کی صنف میں نئے نئے تجربات سے گزر رہے ہیں۔ ویسے تو خواجہ غلام فرید کی نسبت سے "فریدی ڈوہڑے" شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن اکثر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ڈوہڑے خواجہ غلام فرید کی تخلیقات کا حصہ نہیں بلکہ خواجہ فرید کے مریدین نے اپنے کلام کو ان کی نسبت سے تحریر کیا اور اس کلام کو موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے فنکاروں نے محافل کو گرمانے کے لیے خاص طور پر استعمال کیا جس کے باعث یہ ڈوہڑے خاصے معروف ہو گئے۔

ڈوہڑہ کا مزاج کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ ہر شخص اسے اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے اس لیے

دیہات کے لوگ عموماً اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر رات کو چوپال پر اکٹھے ہوتے ہیں اور ڈوہڑے گا نے کی محافل کا خوب انعقاد ہوتا ہے۔ ڈوہڑے میلے ٹھیلے کی رونق بنتے ہیں۔ مویشی چرانے والے، ریوڑ لے جانے والے اور اونٹ لادنے والے جس وقت آبادی سے کچھ دور چلے جاتے ہیں تو کان پر ہاتھ رکھ کر ایک خاص لے سے مدہوش ہو کر ڈوہڑے گاتے پھرتے نظر آتے ہیں اور اپنے اپنے حالات کے مطابق طرح بہ طرح ڈوہڑے گائے جاتے ہیں۔

ڈوہڑہ کی صنف میں ریختی کا انداز خاصا مقبول ہے یعنی عورت کی زبان میں ادا کیے جانے والے کلمات منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ ڈوہڑہ میں عموماً عورت کو محبوب کے بجائے محب کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف موسم بھی ڈوہڑہ کی پہچان رہے ہیں جن میں چیت اور ساون کے مہینوں کے حوالے سے زیادہ تر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ علاوہ ازیں مذہبی شاعری کے طور پر تسخی ڈوہڑے سرائیکی ادب میں اس قدر معروف ہوئے کہ قدیم شعرا میں سے غلام سکندر غلام، سید علی شاہ، عاشق ملتانی، غلام حیدر فدا، بہار ملتانی، امام علی شاہ شفیق، نور محمد گدائی اور نسیم لیہ کے نام عہد حاضر میں بھی معروف سمجھے جاتے ہیں۔

عہد موجود میں متعدد شعرا روایتی موضوعات سے ہٹ کر معاشرے کے مسائل کو سامنے لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کوشش کافی حد تک کامیاب بھی نظر آ رہی ہے۔ مثال کے طور پر احمد خان طارق کا ایک ڈوہڑہ ہے:

اساں کھیاں پڑھ پڑھ اجے رہ گئے ٹل کہیں دے کوں نماز پڑھوں
جتھ بدھ بھانویں جتھ کھول پڑھوں اے پھول نہ پھول نماز پڑھوں
جتھ تسبیح مسجد رقص کروں پاء گھنگرو وچ ڈھول نماز پڑھوں
جتھاں طارق وڑ کے نہ ہووں اوہا مسجد بھول نماز پڑھوں (۳)

سرائیکی شاعری کی کتب میں دیگر اصناف کے ساتھ ڈوہڑہ کی بھی صنف کو شامل کرنے کی روایت خاصی مضبوط لیکن متعدد مجموعہ جات ایسے بھی ہیں جو صرف ڈوہڑہ کی صنف کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر شاکر دے ڈوہڑے، طارق دے ڈوہڑے، اقبال سوکڑی دے چونڑویں ڈوہڑے، ارشد دے ڈوہڑے، شمیم دے ڈوہڑے، سیفل دے ڈوہڑے، امداد اللہ امداد دے ڈوہڑے، آزاد شاہ دے ڈوہڑے، نایاب ڈوہڑے اور ان کے علاوہ بیسیوں عنوانات کے حوالے سے لکھی گئی کتب میں محض

غزل

یہ حقیقت ہے کہ سچل سرمست، خواجہ غلام فرید اور خرم بہاولپوری کی سرائیکی کافیوں میں غزل کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ خرم بہاولپوری کی کتاب "خیابانِ خرم" ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی تو اس قسم کی کافیوں کو غزل کا نام بھی دیا گیا۔ ساٹھ کی دہائی میں جب کچھ شعرا غزل کی صنف کی جانب متوجہ ہوئے تو روایت سے جڑے ہوئے متعدد نظم کاروں نے غزل کی مخالفت بھی کی۔

نقوی احمد پوری کے دو شعری مجموعے "دیوانِ نقوی" اور "قطب تارا" میں ایسی غزلیں پائی جاتی ہیں جو سرائیکی غزل کے ابتدائی دور کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ وہی دور تھا جب غزل کی مخالفت زوروں پر تھی۔

حفیظ خان کے مطابق:

"یہ نقوی احمد پوری ہی تھے کہ جنہوں نے ۱۹۵۲ء میں بہاولپور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی اور اس کے پہلے کنوینر مقرر ہوئے۔ اسی ترقی پسندی نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اردو کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان سرائیکی کو بھی ذریعہ اظہار بنائیں لہٰذا انہوں نے جدید سرائیکی غزل کی بنیاد رکھی اور اس کے ساتھ ساتھ سرائیکی شاعری کی روایتی اصناف یعنی ڈوہڑہ اور کافی میں بھی اپنی جدت طبع سے شعوری مزاحمت کا چراغ جلا دیا۔"(۱)

ویسے تو غزل گو شعرا کے کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں لیکن غزل کی صنف کو اوڑھنا بچھونا بنانے والے لکھاریوں میں اقبال سوکڑی کا نام خاص طور پر معروف ہے۔ اس وقت غزل کی مخالفت کرنے والوں کے جواب میں اقبال سوکڑی نے کیا خوب کہا:

وت کوئی منکر ہے رب دی ذات دا
وت غزل کیہے تیں قتلی پے گئی (۲)

اقبال سوکڑی کی پہلی کتاب "ہنجوں دے ہار" ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی تو اس میں غزل کو

Mir Zaheer Abass Rustmani

CS CamScanner

الگ صنف کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ بعد ازاں مجموعہ "ڈکھدی پیچ" میں بھی غزل شامل رہی لیکن تین مجموعے "کالے روہڑی برف"، "بے ساہت" اور "زمین جاگدی ہے" مجموعی طور پر غزل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مجموعہ کلام "ورقہ ورقہ زخمی" کی غزلیات یونیورسٹی نصاب کا حصہ ہیں جب کہ اکادمی ادبیات پاکستان سے خواجہ فرید ایوارڈ حاصل کرنے والی کتاب "میر ولیر پچانواں" میں شامل غزل کو دور حاضر کی نمائندہ غزل کہا جا سکتا ہے۔ شعری مجموعہ "اٹھواں اسمان" میں غزل کی خصوصی اہمیت کے ساتھ ساتھ جدید نظم بھی شامل ہے۔ ۲۰۲۰ء میں سامنے آنے والے اقبال سوکڑی کے کلیات "سانجھی نصرت سنبھال" کو تمام مجموعہ جات کی غزلیات یکجا ہونے کے باعث سرائیکی ادبی دنیا میں اس صنف کے حوالے سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

قیس فریدی کو سرائیکی غزل گوئی میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "ارداس" ان بنیادی کتب میں شامل ہے جو سرائیکی غزل کو متعارف کرانے کا سبب بنی ہیں۔

ریاض رحمانی کا نام سرائیکی غزل کے میدان میں خصوصی پہچان رکھتا ہے۔ ان کی غزلیات "سوچاں خشبوئے خلاب" کے عنوان سے کتابی شکل میں سامنے آچکی ہیں۔ غزل کے اس مجموعے میں پائی جانے والی سو سے زیادہ غزلیں سرائیکی غزل کے میدان میں اہم اضافہ ثابت ہوئی ہیں۔

رشید عثمانی کے غزلیات کے مجموعے "میں مٹی میں سوا" اور "خواب دریچ دریا" میں وادی ہاکڑہ کے آثار اور چولستانی ثقافتی عناصر کا اظہار خصوصی طور پر ملتا ہے۔ غزلیات کے ان مجموعوں سے پہلے ان کا نظموں پر مشتمل کلام "اکھیں خواب جگارے" بھی سامنے آچکا ہے۔

سرور کربلائی کا شعری مجموعہ "کچھ دا سیدہ" کو دیر آید درست آید کہا جا سکتا ہے جس میں شامل شاعری کی دیگر اصناف عموماً اور غزل کی صنف خصوصاً کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی اپنا آپ منوا چکی تھیں۔ کیفی جام پوری نے سرور کربلائی کے متعلق تحریر کیا کہ ابتدا میں اردو میں شعر کہے۔ بعد میں مادری زبان میں لکھنے لگا اور غلام حسین خان اثر سے اصلاح لیتا رہا۔ بعد ازاں جانباز جتوئی سے صرف عقیدتاً نسبت تلمذ اختیار کر لی۔"(۳)

عزیز شاہد نے ویسے تو سرائیکی شاعری کی مختلف اصناف کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن غزل کی صنف ان کی پہچان بنی۔ عزیز شاہد کے شعری مجموعے "من دریا تے"، "ہتھل سری دے"، "پنجاں"، "جوگ"، "پیڑاں" اور "چھلیں بھری چنگیر" میں غزل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان

کے کلیات "رنگی" اور "روشنی" کے عنوانات سے سامنے آ چکے ہیں جن کے باعث ان کی شاعری تک رسائی آسان ہو چکی ہے۔

جدید نظم میں اہم مقام حاصل کرنے والے رفعت عباس کے ابتدائی شعری مجموعے "پڑچھیاں اُتے چیل" اور "جھومری جھُم تُرے" غزل کے میدان میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان شعری مجموعوں کی غزلیں سرائیکی وسیب کی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہیں۔

تھل کے شاعر سلیم احسن کا اکادمی ادبی ایوارڈ حاصل کرنے والا مجموعہ کلام "جگنو جُھوٹے" کی شاعری جدید غزل کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ سلیم احسن کا دوسرا شعری مجموعہ "چھیتے چھیتے" میں نظم کے ساتھ ساتھ غزل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ غزل جدید دور کے جدید تقاضوں کو پورا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

شفقت بزدار کو تھل موجودہ غزل کا اہم شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ مزاحمتی حوالے سے شعری مجموعہ "تریہہ دا قرض" میں شفقت بزدار نے وسیب کے جبر کا تذکرہ غزل کی زبان میں منفرد انداز سے پیش کیا۔ جب کہ ان کی روایت سے جڑی کتب "نکھیڑے" اور "ریشم رتے" میں دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ غزل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

دور حاضر کے مقبول عوامی شاعر شاکر شجاع آبادی نے روایتی اصناف ڈوہڑہ، قطعہ اور گیت کے علاوہ سرائیکی غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ارشد ملتانی نے شاکر شجاع آبادی کو ایک سچا اور کھرا شاعر ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "وہ آج کے سیاسی و اخلاقی مسائل کے انصاف پر مبنی مثبت حل کی نشاندہی کرتا ہے اور اپنے تخلیقی تجربوں میں پوری جرأت سے بیان کرتا ہے۔ اس کا پیغام کسی قسم کی تضادات کا شکار نہیں ہے۔ وہ حق اور سچ کا داعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مشتاق اُسے بڑے شوق اور محبت سے پڑھتے ہیں۔"(۳)

سرائیکی غزل کی دنیا میں ایک اہم نام مصطفیٰ خادم کا بھی ہے۔ غزل کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنے والی ان کی کتب "پارت"، "ترے دا لیجے"، "پورھیا"، "پتا کی" اور "وچند" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مصطفیٰ خادم کی غزل میں شامل الفاظ کا انتخاب اور وسیب سے لی گئی اصطلاحات نسل نو میں خاص طور پر معروف ہیں۔

خواجہ غلام فرید کے کلام سے لیے گئے عنوانات "واقعڑی روہی"، "تو بجھے تار حساراں"، "میں منٹھوری"، "رات نہاراں" اور "مٹھڑوں پکیاں" والے شعری مجموعوں کے خالق ناصر احمد پوری کی غزل روہی کے ثقافتی عناصر کی خاص طور پر نمائندگی کرتی ہے۔ غلام حسین تگی نے بھی روہی کے مختلف رنگوں کو غزل کے دو مجموعوں "کھیادنیا" اور "کوئی بھی پوچھی" میں قلم بند کیا ہے۔

امید ملتانی کا سرمایہ حیات "پلوں وچ سویر" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں غزل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس مجموعے کی غزل میں عام فہم زبان، ضرب ، مثال، علامات اور محاورے میں پائے جانے والے فطرت کے اظہار سے شامل ہونے کے باعث اسے سماج کا ترجمان کہا جا سکتا ہے۔

اللہ بخش یاد کی غزلیات کا مجموعہ "بلدے بھل" دورِ حاضر کی فرزند تخلیقات میں شامل ہے۔

ملتان کے ادبی حلقوں میں اپنی منفرد پہچان بنانے والی یہ کتاب وسیب کے معاشرتی احوال کی آئینہ دار ہے ریاض عصمت کی شعری تخلیق "تعلی" کے عنوان سے سامنے آئی جس میں پائی جانے والی غزل جدید رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ ان رنگوں میں غم روزگار کا حوالہ سب پر بھاری نظر آتا ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان سے خواجہ فرید ایوارڈ حاصل کرنے والی فریاد ہیروی کی کتاب "کوئی اسمان تے لکھا ہوسی" بھی غزل کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا غزل کا ضخیم مجموعہ "اشنا" اور مجموعہ کلام "سیڑ تے شیروچ" سرائیکی غزل کے فروغ میں اہم کردار کے حامل ہیں۔

فدائے اطہر کی تخلیق "رمحول"، منیر ہاشمی کا کلام "بلدے ڈیوے"، ممتاز احمد زاہد کی کتاب "ڈسکیاں"، نصیر سرمد کی کتاب "سوجھلا"، فیروز شاہ کا مجموعہ "پیٹگ"، محمد رمضان نادار کی تحریریں "واخ" اور "رات تھک پئی اے"، عباس ملک کا کلام "کوار"، عارض بخاری کی تخلیق "سانول موڑ مہاراں"، نواز جاوید کی کتاب "تانگھاں" اور کروڑ (لیہ) سے ہجرت کر کے انبالہ (بھارت) چلے جانے والے قلم کار مہندر پرتاب چاند کی تخلیق "چو بھے" جیسے کئی مجموعے غزل کو متعارف کرانے میں پیش پیش رہے ہیں۔

سید قاسم جلال کا مجموعہ کلام "نکھلاں وی تیج" جہاں غزل کی ابتدائی کتب میں شمار ہوتی ہے وہاں سید قاسم جلال کی کتاب "ستیا" کو عہد نو میں غزل کا نیا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کتاب ۱۳۰۰ اشعار کی طویل غزل پر مشتمل ہے۔ پروفیسر فدائے اطہر کے مطابق قاسم جلال کی جرأت تعریف کے قابل ہے کہ انہوں نے حالی اور اقبال کی قومی اسلامی اور اصلاحی تحریک کا قدم آگے بڑھایا اور سرائیکی میں ایک طویل غزل لکھ کر اپنی ایک بڑی ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ (۵)

فرید ساجد کے شعری مجموعے "پچھتے" اور "بھوکیں تراماں"، امان اللہ کاظم کی تخلیق "ماہلیں منجھ تے ماوے"، امان اللہ ارشد کی کتب "دھمال" اور "اکھیں خواب دے گھر رے"، منظور بھٹہ کا مجموعہ "میڈی کہت دا حساب کیہہ ہے"، بخش منظور احمد کی تصنیف "اکھیں بھال رکھو"، اظہر کلیانی کی کتاب "وسوں تال وساخ"، شاکر حسین کاشف کا مجموعہ کلام "اکھیوں لڑھدی جھل"، حلیم طاہر قیصرانی کا مجموعہ "تیرھویں رُت"، طارق محسن قیصرانی کی کتاب "سمندر رنگ گیا ہوسی"، محمد ظہیر احمد کی کتابیں "بجھو ریت ہوا" اور "لکار"، جاوید آصف کا کلام "تتی کچاوے چڑھی" اور "کھارے چڑھدی سک"، حبیب اللہ طارق کے مجموعے "بیریں برا گڑے پیا رووے"، "پکھیں پٹھو ستارا" اور "شامد" کو سرائیکی غزل کے اہم مجموعوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

جمشید ناشاد کے شعری مجموعے "پرلی کندھی"، "پرایا چندر" اور "ملاتیں وٹھ جہان"، محمد مظہر نیازی کی تخلیقات "تتی دا وین" اور "لوظ"، اصغر گورمانی کا مجموعہ "سیپ"، دمساز قیصرانی کی کتب "پیار ستیا" اور "ابرامن دے"، رفیق ہمراز کے شعری مجموعے "سوچ سولی" اور "خواب کنارے"، ریاض فاروق بزدار کے مجموعے "تیں نظروں نال ڈٹھے"، "ڈکھ تعبیراں"، "مونجھے منظر"، "بک سطریں تے" اور "روح دا زخم"، طاہر شیرازی کا مجموعہ کلام "جاتراں"، حفیظ اللہ گیلانی کا مجموعہ "تجھ دا سیک"، ظہور احمد فاتح کا مجموعہ کلام "اساں ہجوں دروہ جاتا ہے"، امتیاز فریدی کی تخلیق "عشق ابد انتہا ہیں"، ڈاکٹر گل عباس اعوان کا مجموعہ "لوں لوں جاگدی تس"، شمیم عارف کی کتب "سجاک سوچاں"، "کولک" اور "من دی مسجد"، صفدر کربلائی کی کتاب "ختاں"، عبدالمجید زوار کا مجموعہ "تیون جوگ"، واحد شیراز بزدار کی تخلیق "ست رنگی پینگھ"، خادم حسین کھوکھر کی کتاب "تجھ ابھار یا دے"، کریم بخش شعیب کے شعری مجموعے "کچا گھڑا" اور "سچے موتی"، افضل چوہان کی شعری تخلیق "تجھ دا سیک"، عبدالکریم ساجن کا مجموعہ کلام "ساون کھدا ویندے" اور دیگر متعدد شعراء کے مجموعے سرائیکی غزل کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

۲۰۱۹ء میں سامنے آنے والی نادر لاشاری کی کتاب "کوڑی" میں بلا نقط کلام پایا جاتا ہے کہ جس میں دیگر اصناف کے علاوہ غزل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس پہلے ان کی دو کتب "آس ادھوری" اور "آس سوری" بھی نقاط کے بغیر سامنے آ چکی تھیں۔ جہاں تک کتاب "کوڑی" کا تعلق ہے تو اس کو کلیات کا درجہ حاصل ہے جس میں ابتدائی کتب کے علاوہ نیا کلام بھی شامل ہے۔ "کوڑی" کی اس انفرادیت کے باعث اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے اسے "خواجہ فرید ایوارڈ" کا حق دار

قرار دیا گیا۔ جب کہ ۲۰۲۰ء میں سامنے آنے والے اظہر گیلانی کی غزلیات کے مجموعہ "دھوں تال وساخ" کو بھی اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے "خواجہ فرید ایوارڈ" کا اعزاز حاصل ہوا۔

سرائیکی کے صاحب کتاب قلم کاروں میں جانباز جتوئی، نور محمد سائل، احمد خان طارق، سفیر لاشاری، دلشاد کلانچوی، مجید ال [illegible]، عبداللہ یزدانی، شاکر شجاع آبادی، بخت علی سرور، محمد رمضان طالب، محمد اسلم میتلا، جہانگیر مخلص، شاکر مہروی، عاصم آچوی، حسین گوہر، شکیل پتافی، امجد بلوچ، اختر محمود، انجم لاشاری، اعجاز ڈیروی، ریاض قیصر، جمشید کمتر، رحیم طلب، فیض بلوچ، مصطفیٰ عدم، اقبال قریشی، بشیر شائق، ممتاز آچوی، سرحد رنگ پوری، عبدالاحد حسن کورمانی، ساقی سمولی، قاسم سہانی، محمود بخاری، مختیار الفاری، شاہد عالم شاہد، ساجد رادی، اقبال حسن بھپلا، اے بی عاصم، صادق تبسم، حیدر یزدانی، ساجد ملتانی، عارش گیلانی، مالک اشتر، قمر الحق لیوری، عبدالرحمن عبد، خاور نقوی، آسی سیتلوی، عارف گلشن، خلیل احمد فریدی، ریاض ارم، رستم نانگی، کریم بخش نیر، صادق مہر، شبیر ناقد، افضل سواگری، اللہ بخش شمر، فیض فریدی، انور رشید، نور محمد حیدر الملت ملتانی (راقم) اور دیگر قلم کاروں کی کتب میں دیگر اصناف شعر کے ساتھ ساتھ غزل کی صنف کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

سرائیکی کے خواتین ادب پر نظر دوڑائی جائے تو بخت آور کریم کی کتاب "اکھ سک دیاں" بہار افشاں بہار کے شعری مجموعے "تجل [illegible]" اور "سکھے خواب میڈے" نجم سیال کا شعری مجموعہ "ترانے واشتر"، رضوانہ تبسم درانی کی تخلیقات "چاناں چاہاں ونگ" اور "کونج چنڑ تھیندی"، صابرہ شاہین کا مجموعہ کلام "قافی [illegible]"، حنیفہ ملک کے شعری مجموعے "ہنجوں دی مالا" اور "جھکیں تیں گندی"، عابدہ عارش کی کتاب "تجت گلسی" اور شبنم اعوان کے شعری مجموعے "بوچھن" میں غزل کی صنف کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ شیما سیال، بشریٰ قریشی، بانو بلوچ، صباحت عروج اور دیگر متعدد شاعرات نے شعری مجموعے شائع نہ ہونے کے باوجود سرائیکی غزل میں اپنا اپنا حصہ شامل کیا۔

سرائیکی ادب کے متعدد اہم قلمکاری ایسے بھی ہیں جنھوں نے غزل گوئی کو تو اپنی شاعری کا حصہ بنایا لیکن بوجوہ ان کے شعری مجموعے شائع نہ ہو سکے جیسا کہ رشید قیصرانی، محسن نقوی، غفور ستاری، ممتاز عاصم، مجبور بخاری، طارق جامی، رفیق خاور جسکانی، صدیق طاہر، ممتاز اطہر، انور سعید انور، فرحت ملتانی، اختر جعفری، جاوید احسن خان، نادر قیصرانی، اخلاق حرازی، بشیر قمر تواری، تنویر شاہد محمد زئی وغیرہ وغیرہ۔

سرائیکی ادب میں غزل کے سفر کا جائزہ لیتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ تخلیقی شعری مجموعوں کی اشاعت سے بھی پہلے غزل کی مرتبہ کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ گویا یہ کتب سرائیکی کا غزل محل بنانے کی بنیاد میں شامل ہونے والی اینٹوں سے کم نہیں ہیں۔ ان کتب میں صادق بشیر کی تالیف "رت دیاں ہنجوں" (۱۹۶۷ء)، ممتاز حیدر ڈاہر اور فانی الہ آبادی کی تالیف "وجھے تیر" (۱۹۷۳ء) اور سرائیکی مجلس ملتان کے طرحی مشاعروں کی غزلیات کے حوالے سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہونے والی کتاب "سینگھو مہار" (مرتب: اسید ملتانی، خادم ملتانی، فرحت ملتانی) کے نام خصوصی طور پر گنوائے جا سکتے ہیں۔ طرحی غزلیات کے مرتب کردہ مجموعہ "سینگھو مہار" کے مقدمہ میں اسلم انصاری رقم طراز ہیں:

"جدید سرائیکی غزل ہماری قومی ادبیات میں ایک نئی جہت کا اضافہ کر رہی ہے۔ اس میں روایت کو جذب کرنے کی استعداد بھی ہے۔ اور زندگی کے نئے تجربات کو خوش آمدید کہنے کی خصوصیت بھی۔ زمین کی مہک بھی ہے اور رشتوں کی پہچان بھی۔ آج کا سرائیکی شاعر اپنی فنی اور معاشرتی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔"(۶)

غزل کی مرتبہ کتب کے علاوہ ابتدائی طور پر شائع ہونے والی منظوم سرائیکی ترجمے کی دو کتب "غالب دیاں غزلاں" (۱۹۶۹ء) اور "بال جبریل" (۱۹۷۳ء) بھی سرائیکی غزل کے ارتقائی سفر میں ممد و معاون ثابت ہوئی ہیں۔ "غالب دیاں غزلاں" کو رودی کے معروف قلمکار دلشاد کلانچوی نے سرائیکی روپ دیا۔ جب کہ علامہ اقبال کی کتاب "بال جبریل" کی منتخب غزلیات کو تھل کے نامور شاعر نسیم لیہ نے منظوم سرائیکی ترجمے کے طور پر کتابی شکل دی۔

حوالہ جات

۱۔ حفیظ خان: "سرائیکی ادب افکار جہات"۔ ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۰۹ء، ص ۹۰-۹۱

۲۔ اقبال سوکڑی، کالے رود و چٹی برف، دیرہ غازی خان: اٹلس پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء، ص ۸

۳۔ کیفی جام پوری، سرائیکی شاعری، ملتان: بزم ثقافت، ۱۹۹۹ء، ص ۳۲۶

۴۔ ارشد ملتانی، شاکر شجاع آبادی ایک سچا اور کھرا شاعر، مشمولہ "کلام شاکر" از شاکر شجاع

آبادی، ملتان: جھوک پبلشرز، ۲۰۰۲ء، فلیپ

۵۔ فدائے اطہر، پروفیسر، سرائیکی دا اقبال: ڈاکٹر سید قاسم جلال، مشمولہ "سنیہا" از سید قاسم جلال، مظفرگڑھ: مرکز تعلیم و تحقیق برائے زبان وادب، ۲۰۱۵ء، ص ۳۲

۶۔ اسلم انصاری، مقدمہ، مشمولہ "سنگت ملہار" مرتب: امید ملتانی، منہ دم ملک ملتانی اور فرحت ملتانی، ملتان: سرائیکی مجلس، ۱۹۷۷ء، ص ۱۷

جدید نظم

رفیع الدین ہاشمی کے مطابق:

"غزل کی پختہ روایت اور اس کے قبول عام کے ردعمل میں جس نظم کو فروغ ہوا یہی "نظم جدید" ہے۔۔۔۔ نظم جدید تمام قدیم اصناف سخن سے بالکل مختلف چیز ہے اس لیے یہ ایک الگ اور جدید صنف شعر ہے۔ نظم جدید میں موضوع یا ہیئت کی کوئی قید نہیں البتہ زبان، طرز بیان اور اپنے علامتی انداز کے سبب یہ دیگر اصناف سے ممیز کی جا سکتی ہے۔ نظم جدید میں داخلیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ اس میں شاعر اپنے باطن کی گہرائیوں میں ڈوب کر انفرادی اور ذاتی ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔"(۱)

سرائیکی شاعری میں ہیئت کے اعتبار سے جدید نظم کی مختلف شکلیں پائی جاتی ہیں جن میں پابند نظم، آزاد نظم، معرا نظم، نثری نظم، ہائیکو اور سرائیکو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

سرائیکی شاعری میں جدید نظم کو متعارف کرانے کے حوالے سے رفیق خاور جسکانی کی ابتدائی کاوش کو سراہا جاتا ہے جب کہ ارشاد تونسوی کو آزاد نظم اور معرا نظم کا باقاعدہ اولین شاعر تصور کیا جاتا ہے جن کی کتاب "ندی ناں بولک" کو "دریا پیورست آیہ" کہہ سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں محبوب تابش نے شمیم عارف قریشی کے حوالے سے لکھا ہے:

"جدید سرائیکی نظم کا پہلا شاعر شاید حتمی طور پر دریافت کرنے میں کچھ مشکل ہو مگر یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے جدید سرائیکی نظم کا کامیاب تجربہ کرنے والا شاعر ارشاد تونسوی ہے ان کی نظموں میں انسانی زندگی پر نئے سرے سے سوچا گیا ہے۔"(۲)

ارشاد تونسوی کے حوالے سے حفیظ خان لکھتے ہیں کہ یہ ارشاد تونسوی ہی تھا جس نے ستر کی دہائی کے حبس میں اس سرائیکی صوفی اور لوک کلاسک ورثے کو اپنے عصری شعور کے تقاضوں کے مطابق

CS CamScanner

اپنے عہد پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ (۳)

جدید نظم کی ابتدائی کتابوں میں حسن رضا گردیزی کا شعری مجموعہ "دھاپے دھوڑے" کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس مجموعے میں مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل نظموں کے کئی تجربے کیے گئے۔ اقبال سوکڑی نے وقت کی رفتار کے پیش نظر ہر صنف میں شاعری کی ہے۔ ان کی کتابوں میں سے "ورقا ورقا ڈکھ" ، "لیرو لیر پچھاواں" اور "اٹھواں اسمان" میں بھرپور نظمیں شامل ہیں۔ جبکہ سرور کربلائی کا مجموعہ کلام "سجھ دا سیک" متعدد اصناف پر مشتمل ہے جس میں جدید نظم کے کئی رنگ بھی پائے جاتے ہیں۔

ممتاز حیدر ڈاہر کی کتاب "اندھارے دی رات" ساری ورود نظم کو اس قدر سمیٹے ہوئے ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے قاری کو سب غم اپنے غم محسوس ہوتے ہیں۔ قیس فریدی نے غزل کے ساتھ ساتھ آزاد نظم کو بھی وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ ان کی کتاب "پرکھرا" میں سرائیکی ثقافت کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ حیدر گردیزی نے اپنی کتاب "ساوا ونگل" میں سرائیکی شاعری میں ہائیکو کو متعارف کرایا جب کہ ان کی کتاب "سمھاں تے چندر" آزاد نظم میں روزمرہ کے معاملات کی نمائندگی کرتی ہے۔

عزیز شاہد کی کتابیں "سن دریا تے" ، "بھل سرتی دے" اور "اول" میں پائی جانے والی نظمیں سرائیکی ثقافت خصوصاً ملتان کے خطے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر نصراللہ خان ناصر کی کتاب "اجرک" میں روہی کی خوشبو رچی بسی نظر آتی ہے اور ڈاکٹر مہر عبدالحق کے شعری مجموعے "الاریاں" میں تھل کی منظر کشی کا منفرد رنگ موجود ہے جب کہ شمیم حسن اختر کا شعری مجموعہ "ملوہا سدا سہاگن" میں ملتان کی عظمت کی تاریخ رقم کی گئی ہے۔

رفعت عباس کا نام نثری نظم کے حوالے سے سرائیکی شاعری کی شناخت بن چکا ہے۔ ان کی کتاب "جھومری جھوئیں تے" سرائیکی نظم کی نئی ہیئت کے طور پر سامنے آئی جس میں انسان کے ارد گرد کے حوالے سے غور و فکر کا سبق ملتا ہے۔ مجموعہ کلام "پروبھرے ہک شہر اچوں" ایک طویل نظم پر مشتمل ہے جو دور حاضر میں تخت شاہی سے دور بسنے والے قدیم اور اہم شہر ملتان اور اس کے مضافات کی نمائندگی کرتی ہے۔ رفعت عباس کی شعری تخلیق "ماہ ولی دا باغ" میں جیتا جاگتا وسیب بولتا نظر آتا ہے اور یہ نظمیں تاریخ اور تہذیب کو واضح کرتی ہیں۔ جب کہ شعری مجموعہ "ایں نارنگی اندر" غزل کی ہیئت میں ابیات کا ایسا خزینہ ہے جس میں پوری دنیا میں پائے جانے والے زندگی کے مختلف رنگوں کو منفرد انداز سے سمیٹنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔

CamScanner

مثال کے طور پر ویہویں صدی کے حوالے سے ایک اقتباس ہے:

ویہویں صدی سیکل وانگوں پئے چلیندے باسے
ویہویں صدی واجے وانگوں پئے وجیندے باسے
کہیں کہیں ویلے ڈسدے باسے ٹنگیاں قلماں اندر
بولن ڈیہناں قلماں اندر ٹک ٹک وجدے باسے (۴)

اشولال کا شعری سفر "چھیڑو ہتھ نہ مرلی" سے شروع ہوا جس میں وسیبی ثقافت کے متعدد رنگ شامل ہیں۔ شعری مجموعہ "گوتم نال جھیڑا" میں علامت کا اظہار اس انداز سے کیا گیا کہ انسان اور انسانیت کے حوالے سے شامل مختلف موضوعات تو پہیلیوں کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ مجموعہ کلام "کاں وسوں دا ککھی اے" میں سندھ وادی کی قدیم تہذیب میں سے ٹیکسلا، روہی چولستان، دمان، ملتان، ہڑپہ اور موئن جو دڑو کے حوالے سے قدیم اور جدید ثقافتی رویے پیش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ اشولال کی کتابوں میں "سندھ ساگر نال ہمیشاں" کے عنوان سے سامنے آنے والی دو جلدیں منفرد نوعیت کی حامل ہیں۔ جن سے محسوس ہوتا ہے کہ اشولال دریائے سندھ سے اس قدر عشق کرتے ہیں کہ ان کی نظمیں اسی نسبت سے پہچانی جاتی ہیں۔ نمونے کے طور پر اس کتاب کی اہم نظم کا ایک حصہ پیش ہے:

دریا او دریا پانی تیڈے ڈونگھے
توں ساڈا پیو ما اساں تیڈے پونگے
دریا او دریا پانی تیڈے ساوے
اوہو ویلا ہر دم جیوندا نال راوے
دریا او دریا تیڈے ساڈے سانگے
جیہاں دی صورت پانیاں دے وانگے (۵)

عاشق بزدار کی کتاب "قیدی تخت لہور دے" مزاحمتی شاعری کی اہم مثال ہے۔ اسلم جاوید کی کتابیں "سکوں آکھ تے بیچ دریائی"، "ست سرائی" اور "طبل کو بازی" بھی مزاحمت و علامت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جہانگیر مخلص کا شعری مجموعہ "پرو باکھ" میں مزاحمتی اور ثقافتی رنگ واضح نظر آتے ہیں۔ اسی طرح مظفر خان گھسی کی نظموں کا مجموعہ "سدراں دا سانجھ سنجان" بھی وسیب سے ہونے والی ناانصافیوں کے حوالے سے مزاحمتی رنگ اپنائے ہوئے ہے۔

Mir Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

سعید اختر کے شعری مجموعے "دریا سندھ کنارے"، "وساکھ" اور "توکا" میں پائی جانے والی نظمیں انفرادیت کی حامل ہیں۔ دریائے سندھ اور ڈیرہ اسماعیل خان سے تعلق کو ان کتب میں خاص طور پر واضح کیا گیا ہے۔

شفقت بزداری کی کتابیں "کر یہہ دا قرض"، "ریشم رستے" اور "نکھیڑے" میں غزل کے علاوہ جدید نظم کے تمام رنگ شامل ہیں۔ ان کتب میں شعری ہنر کے ساتھ ساتھ احتجاجی سلسلے اور سرائیکی دنیا ن کی چاشنی خاص طور پر موجود ہیں۔

میانوالی کے شاعر سلیم احسن نے غزل کے تجربے کے بعد اپنی کتاب "چیتے چیتے" میں آزاد نظم اور معرا نظم کو بھی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے جس میں تھل کے مناظر قدرت کی عکاسی خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔

صابر چشتی کا شعری مجموعہ "جیون اتم جوگ" ماں دھرتی سے بھرپور انداز میں عقیدت کے اظہار کا درس دیتا ہے۔ مصطفیٰ خادم کے شعری مجموعے "پارت" اور "نوار نجھے" میں پائی جانے والی نظمیں روحانی اور روحانی تہ ترات کی آئینہ دار ہیں۔ محمود بخاری کے شعری مجموعے "سر دھرتی دی ویل" اور "کجھ الا ساتو لا" کی نظمیں روہی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ عابد عمیق کی کتابیں "گل دلیجی" اور "بکھی جا تک تے رستہ" اللہ بخش یادی نظموں کا مجموعہ "پچھیراں دا" شوکت ہاشمی کا کلام "تو دا ہو کا" ماکبر ہاشمی کی تخلیق "نکھودا پکھا"، نادر نقوی کی کتاب "جھل دا لوتا"، مجید اعوان کی تخلیق "انہد" اور جاوید آصف کا شعری مجموعہ "دساندر" سرائیکی کی نظم جدید کی اہم مثالیں ہیں۔ اقبال قریشی کے متعدد شعری مجموعے "عشق" کے موضوع کے گرد گھومتی نظموں سے سرشار ہیں۔ جب کہ نسیم شہزاد کا مجموعہ "ویریں لڑا شہر" کافی کے جدید رنگ کے علاوہ نظم کے جدید رنگ کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔

خالد اقبال کی کتابیں "کھسیاں گھب کھنڈا ہے"، "چپ دے گھے بک میں"، "چندھ کو لیاں دا"، "کو یلی دی کاوڑ" اور "سیجھ وچھوں سونہہ" جدید نظم کے منفرد رنگ لیے ہوئے ہیں۔ خالد اقبال نے ماں دھرتی کی ثقافت کے مختلف رنگ اکٹھے کر کے ایسا گلدستہ پیش کیا ہے جو وسیب کے مناظر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

زبیر احمد کا شعری مجموعہ "چاندی مڑھے طاق" میں دمان خصوصاً تونسہ کی ثقافت اور روحانیت کے عناصر کو آزاد نظم اور معرا نظم کی شکل میں سامنے لایا گیا۔ مالک اشتر کی کتابیں "بند صوبت" اور"

نظمیں دے جیسے ''بھی سنگھڑو (تونسہ) کے علاقے کے تہذیبی رنگ اور میدانی علاقے کا دریائے سندھ
سے قرب ظاہر کرتی ہیں۔ محمود قلندری کی کتابیں ''ترشنا''، ''تراں دی جھنگ'' اور ''ترش'' میں دامان کے
اساطیری حوالے نمایاں ہیں۔ طاہر شیرازی کا مجموعہ کلام ''جاتراں''، مشیر علی تابش کی کتاب کھجیریاں اور
ابرار عقیل کا مجموعہ ''پچھ'' کی نظمیں بھی دامان خصوصاً ڈیرہ اسماعیل خان کے ماضی و حال کی ترجمانی کا حق
ادا کیے ہوئے ہیں۔

رحیم طلب کی کتابوں ''پیارا دا پہلا ساون'' اور ''سوہا چاندی'' میں مختصر نظموں کو اظہار کا وسیلہ بنا
یا گیا ان نظموں میں جہاں کوئی نہ کوئی پیام پوشیدہ ہے وہاں ابلاغ کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ اصغر عابد کی
کتاب ''چھدا'' میں ''ہائیکو'' کی صنف بھرپور انداز میں شامل ہے جبکہ رفیق امراز کے مجموعہ کلام ''خواب
کنوارے'' میں دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ ''سرائیکو'' کی صنف کو خاص طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔

ریاض قیصر قیصرانی کا مجموعہ کلام ''پاکروال'' کی نظمیں، جدیدیت کی واضح مثال ہیں۔ ریاض
فاروق بزدار کی کتابوں میں دیگر اصناف کے علاوہ ''وائی'' کو آزاد نظم کے رنگ میں پیش کرنے کی شعوری
کوشش کی گئی ہے جب کہ دمساز قیصرانی کی شاعری میں معرا نظم کا انداز انفرادیت کا حامل ہے۔ عبد
اللطیف بھٹی کا شعری مجموعہ ''بیڑی دا چک سارا پور'' اور ڈاکٹر اظہر علی کی تخلیق ''جھاتی'' ملتان کے ادبی
حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ نادر القادری نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی بے نقط
شاعری کا تجربہ کیا ہے۔

غلام حسین تگلی روحی کے معروف شاعر ہیں جنہوں نے روایت اور جدیدیت کے امتزاج کو
ذریعہ اظہار بنایا۔ ان کی کتاب ''گھمریکار'' کی نظمیں زیادہ تر روایت سے جڑی ہوئی ہیں۔ جب کہ ''کرنی
بھرنی'' کے عنوان سے سرائیکی زبان کی ضرب الامثال کو منظوم رنگ میں پیش کرنے کا نیا تجربہ کیا ہے
۔ اسی طرح کتاب ''لیکھا چوکھا'' کے عنوان سے سامنے آنے والی اصناف میں نظم کی صنف مزاحمت اور
انقلاب کی نمائندگی کرتی ہے اور شعری مجموعہ ''مہتیں مٹھیں'' میں انسان دوستی اور اصلاح معاشرہ جیسے
رویے نمایاں ہیں۔

دلشاد کلانچوی کی کتاب ''کلام کلانچوی''، جمشید کمتر کے متعدد شعری مجموعے، جمشید ناشاد کی
کتابیں ''پری کندی'' اور ''مٹھیں پٹھڑ جہان''، فریاد ہیروی کی متعدد کتابیں، عبد القدوس ساجد کا مجموعہ
کلام ''تیر کلاہی''، افضل سوکڑی کی تخلیقات ''ٹھڑی جاک لوریاں'' اور ''سکھڑیں جتا''، جمشید کلانچوی

اعوان کا کلام "لفظیں دے پکھل"، منور عباس منور کی تخلیق "مٹی میڈے پیریں دی"، قاسم سبانی کی تخلیقات "مونجھ دا سیلہ" اور "ٹل ٹمیں تھلدے"، شریف پردیسی کی کتاب "ہنج دے حاشے"، فاروق راول کا مجموعہ "روگ رچ ہسیں"، صادق میر کی شعری تخلیق "روح دا روگ"، شبیر ناقد کا شعری مجموعہ کلام "سن وی سجھ"، ڈاکٹر گل عباس اعوان کی کتابیں "سوجھل خواب" اور "ون لوں جاگدی تس"، منظور بلوچ کی کتاب "آسیں واست ماڑ" اور حمید الفت ملغانی (راقم) کے مجموعہ کلام "بنت سوجھل" کے علاوہ ایسی متعدد کتب سرائیکی شاعری کے فروغ میں اہم کردار کی حامل ہیں جن میں دیگر اصناف فن کے علاوہ جدید نظم خصوصاً آزاد نظم اور معرا نظم بھی شامل ہیں۔ جب کہ ارشد ملتانی، ممتاز اطہر اور حبیب فائق جیسے متعدد شعرا کا کلام شائع ہو جاتا تو سرائیکی شعری ادب میں جدید نظم کی صنف کو مزید فروغ حاصل ہوتا۔

اقبال بانو کی کتاب "دل تانگھ تانگھے" خواتین ادب میں پہلا باقاعدہ مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں پائی جانے والی نظمیں مزاحمتی اور طلاقی رنگ میں پیش کی گئی ہیں۔ بہار النساء بہار کی کتابیں "تجل تل اکھیں" اور "سچے خواب میڈے" کی نظموں میں بھی کھری اور کڑوی بات کو واضح انداز میں بیان کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔ سحر سیال کے شعری مجموعہ "ترامے دا شہر" میں پائی جانے والی چھوٹی چھوٹی نظموں میں بڑی بڑی باتیں دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہیں۔ جدید نظم لکھنے والی شاعرات میں مسرت کلانچوی، شیما سیال، بشریٰ قریشی، بانو بلوچ، ممتاز عنبرین اور دیگر کئی نام شامل ہیں جن کا کلام کتابی شکل میں سامنے آنے کا منتظر ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے "خواجہ فرید ایوارڈ" حاصل کرنے والی کتابوں میں نظم جدید کے حوالے سے بالترتیب ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر کا شعری مجموعہ "اجرک"، عزیز شاہد کا مجموعہ کلام "پکھل سری دے"، اقبال سوکڑی کی تخلیق "لیرو لیر پچھاواں"، رفعت عباس کی کتاب "جھومری جھوکیں تے"، زبیر احمد کا مجموعہ "چاندی مڑھے طاق"، سعید کی نظموں کا مجموعہ "وساکھ"، سرور کربلائی کی متعدد اصناف پر مشتمل "مجھ دا سیت"، ارشاد تونسوی کی شعری تصنیف "ندی ناں سنجوگ"، سلیم شہزاد کی نظموں اور گیتوں کا مجموعہ "پیریں فرد اشہر"، صابر چشتی کا شعری مجموعہ "جیون آتم جگ" اور رفعت عباس کی جدید نظم کی اہم کتاب "ایں مارگی اندر" شامل ہیں۔

نثری اصناف

CS CamScanner

ناول

ناول کی صنف اردو میں انگریزی کے واسطے سے اور سرائیکی میں اردو کے وسیلے سے متعارف ہوئی۔ ادبی دنیا میں انگریزی ناول اٹھارویں صدی عیسوی، اردو ناول انیسویں صدی عیسوی اور سرائیکی ناول بیسویں صدی عیسوی میں سامنے آیا۔ اردو ادب میں ناول نگاری کے بعد تخلیق کار افسانہ نگاری کی جانب مائل ہوئے جب کہ سرائیکی ادب میں افسانہ پہلے تخلیق ہوا اور ناول کی تخلیق بعد میں ہوئی ۔ سرائیکی ادب میں افسانہ پہلے تخلیق ہوا اور ناول کی تخلیق بعد میں ہوئی۔ سرائیکی ادبی دنیا میں ابتدائی افسانہ نگاری بعد میں ناول نگاری کی جانب راغب ہوئے۔

سرائیکی ناول نگاری میں ابتدائی نام غلام حسن حیدرانی کا ہے جنہوں نے افسانہ نگاری کے بعد ناول نگاری کی جانب توجہ دی اور "کچھو" کے عنوان سے لکھے گئے ان کے ناول کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کے مطابق:

> "غلام حسن حیدرانی مرحوم نے ۱۹۶۸ء میں ایک ناول "کچھو" لکھا جسے وجند ولی پروڈکشنز نے سرائیکی زبان میں فلمانے کا فیصلہ بھی کیا۔ جولائی ۱۹۶۹ء میں ماہوار رسالے 'اختر' ملتان نے اس کا اشتہار شائع کیا اور ستمبر کے شمارے میں اسے سرائیکی زبان کا پہلا ناول بھی قرار دیا۔"(۱)

"کچھو" کو کہیں ناول کہا گیا، کہیں ناولٹ لکھا گیا اور کہیں طویل افسانے سے تعبیر کیا گیا اور اس کی قسط وار اشاعت کے بارے میں بھی مختلف آرا سامنے آئیں۔ دلشاد کلانچوی نے "کچھو" کے بارے میں لکھا ہے:

> "کچھو کو بھی افسانہ کہا گیا ہے لیکن اس کا پلاٹ یا تانا بانا ناول کا سا ہے۔ اس کی طوالت کو دیکھ کر اور ناول کے دیگر لوازمات پا کر اسے ناول نہیں تو ناولٹ با آسانی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ناولٹ ۔۔۔ قسط وار رسالہ سرائیکی ادب ملتان میں مئی ۱۹۷۳ء کے شمارے میں چھپنا شروع ہوا۔ آغاز میں اس کا مختصر تعارف بھی تھا۔

جس میں رسالے کے ایڈیٹر عمر علی خان نے لکھا کہ آپ نے صحیفۂ سب رس کے
قسط وار ناول تو پڑھے ہوں گے۔ اسے پڑھیں گے تو ان کو بھول جائیں گے۔
اگلے ماہ کسی مصلحت کی وجہ سے دوسری قسط نہ چھپی۔ پھر جولائی ۱۹۷۳ء کے شما
رے میں ایک معذرتی نوٹ کے ساتھ ناولٹ کا خلاصہ چھاپ دیا گیا۔"(۴)

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ سرائیکی ناول نگاری کی ابتداء ساٹھ کی دہائی میں غلام حسن حیدرانی کے لکھے جانے والے جاسوسی ناول "گلو" سے ہوئی۔ جسے قسط وار شائع کرنے کا سلسلہ تو شروع ہوا لیکن یہ سلسلہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور اس ناول کی محض تلخیص شائع کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ یوں اس ناول کو کتابی صورت میں پیش کرنے کا وعدہ بھی وعدۂ فردا ہی ثابت ہوا۔ اس طرح سرائیکی زبان میں پہلا لکھا جانے والا ناول نہ تو قسط وار شائع ہو سکا اور نہ ہی کتابی شکل میں سامنے آ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے سرائیکی ناول نگاری کی ابتدائی کاوش تو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اشاعت کے مراحل طے نہ کرنے کے باعث اسے اولین ناول کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

سرائیکی زبان میں ناول کی اشاعت کا آغاز ظفر لاشاری کے ناول "نازو" سے ہوتا ہے اور اسی کو سرائیکی کے طبع شدہ اولین ناول کا درجہ حاصل ہے۔ ۱۹۷۱ء میں سامنے آنے والے اس ناول کی ابتدا قیام پاکستان کے موقع پر ہونے والے فسادات سے ہوتی ہے۔ اس ناول کا مکمل جائزہ لیا جائے تو اسے ایک رومانوی ناول سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو کہ کالو محسن اور رحمتی کے دیہات میں رہائش پذیر ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ کالو محسن بے اولاد ہے۔ قیام پاکستان میں پیش آنے والے واقعات کے دوران میں اسے ایک لاوارث ہندو بچی ملتی ہے جسے وہ اپنی بیٹی بنا لیتا ہے اور اس کا نام "نازو" رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ بچی بڑی ہو کر کالو محسن کے بھتیجے اختر سے منسوب کر دی جاتی ہے۔ لیکن شادی سے پہلے نازو (ناول کی ہیروئن) اور اختر (ناول کا ہیرو) ایک حادثے کے نتیجے میں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اس حادثے میں نازو کی یادداشت کھو جاتی ہے۔ ایک ڈاکٹر ترس کھا کر نازو کو اپنے گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ پناہ دے دیتا ہے۔ ایک عرصے کے بعد اختر اور نازو کی ملاقات ہوتی ہے لیکن نازو اسے پہچاننے سے انکار کر دیتی ہے۔ بعد ازاں ایک اور حادثہ رونما ہوتا ہے جس کے باعث نازو کی یادداشت واپس آ جاتی ہے اور بالآخر دونوں ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔

دلشاد کلانچوی "نازو" کے بارے میں رقم طراز ہیں:-

Mir Zaheer Abass Rustmani

CamScanner

> "ناول کے پلاٹ میں قصہ کی سی کیفیت بھی بھرپور انداز سے موجود ہے۔ تجسس بھی ہے۔ تاخیر و تحیر بھی ہے۔ قصہ کی کڑیوں سے کڑیاں جڑی جاتی ہیں۔ واقعات کافی دلچسپ ہیں۔ جزئیات بھی خوب ہیں۔ عشق و محبت کو رنگ بھی ہے اور نفرت و حقارت کے حربے بھی۔ غلط فہمیوں اور سمجھوتوں کی گتھی سب ہی کھل جاتی ہے۔ روٹھنے اور من جانے کے انداز بھی پائے جاتے ہیں۔ ہندو لڑکی کے ایک مسلمان کے گھر میں پرورش پانے سے مذہب کا رویہ بھی موجود ہے اور دو مختلف سمتوں کو چلنے والے کردار ایک ہی راستے پر بھی آ جاتے ہیں۔ ایسی کئی اور باتیں ناول کے پلاٹ کی سی خوبی اور چاشنی پیدا کر جاتی ہیں۔" (۳)

ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے مطابق "نازو" بنیادی طور پر ایک رومانوی ناول ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اصول ملنا، بچھڑنا اور پھر مل جانا یا ملنا، بچھڑنا اور دوبارہ نہ مل سکنا، رومانوی کہانیوں کے حوالے سے لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔ اسی اعتبار سے نازو بھی ایک ایسا رومانوی ناول بنتا ہے جس میں ملنے اور بچھڑنے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ (۴)

اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد نے پاکستانی زبانوں کے ادب کو متعارف کرانے اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے کئی سلسلے شروع کیے جن میں اولین ناول کے تراجم کا سلسلہ بھی شامل ہے۔ سرائیکی کے اولین ناول "نازو" کا اردو ترجمہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے حمید الفت ملغانی (راقم) نے رواں ترجمے کے طور پر اردو روپ دیا۔ اس ترجمے کے حوالے سے دیباچہ نگار ڈاکٹر ظاہر تونسوی رقم طراز ہیں:

> "اکادمی ادبیات پاکستان سرائیکی وسیب کے خاص شکریے کی مستحق ہے کہ دیگر پاکستانی زبانوں کے اولین ناول کے تراجم کے منصوبے میں سرائیکی کو بھی شامل کیا اور یوں ظفر لاشاری کا پہلا مگر مقبول ناول 'نازو' بھی اردو ترجمے کے حوالے سے پڑھنے والوں کو نصیب ہوا۔ جہاں اس ناول کے ترجمے سے ظفر لاشاری کو ایک وسیع حلقہ قارئین میسر آئے گا اور اسے ان کے فن کی داد ملے گی وہاں حمید الفت ملغانی کے اس کامیاب ترجمے کو بھی سراہا جائے گا کہ ترجمے کے حوالے ہی سے سرائیکی زبان کی اس اہم دستاویز کو مطالعے کی میز فراہم کی ہے۔" (۵)

" آنجڑیں رت جو پاٹریں تھی" کے عنوان سے منیر احمد علوی کا مختصر ناول جولائی ۱۹۷۲ء میں پیش کیا گیا۔ دو بھائیوں کی اس کہانی میں بڑا بھائی خدا بخش اپنے چھوٹے بھائی غلام نبی کو بڑا آدمی بنانے کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ اسے شہر میں حصول علم کے لیے بھیجنے کے ساتھ ساتھ ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہے لیکن چھوٹا بھائی غلام نبی کالج کی تعلیم کے دوران میں نئے زمانے کی روش کا پتا تے ہوئے ایک سنگلری یعنی رضیہ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ جس کے باعث اس میں ہر قسم کی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خدا بخش کو پتا چلتا ہے تو وہ اسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ لیکن غلام نبی پر عیش و عشرت کا بھوت اس قدر سوار ہو جاتا ہے کہ وہ بڑے بھائی کی کسی بات پر دھیان نہیں دیتا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ غلام نبی اپنے دوستوں کے ہمراہ اپنے بڑے بھائی کی گندم کی ڈھیری لوٹنے کے لیے آ جاتا ہے اور خدا بخش مارا جاتا ہے۔ مگر غلام نبی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ گویا اس کا خون سفید ہو چکا ہوتا ہے۔ بظاہر اس ناول کا ہیرو غلام نبی ہے لیکن حقیقت میں دیکھا جائے خدا بخش کا کردار ہیرو کے طور پر سامنے آتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم عزیز درانی نے منیر احمد علوی ناول کے پلاٹ کو خاصا معقول قرار دیا لیکن مقصدیت غالب آ جانے کے باعث ناول کو فنی طور پر کمزور کہا ہے علاوہ ازیں یہ بھی بتایا کہ سارے ناول پر حزنیہ فضا چھائی ہوئی ہے جو کہ اختتام پر اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے اور اس کا اختتام فلمی انداز کا ہے۔ نیز منیر احمد علوی نے بول چال کے عربی فارسی الفاظ کی بگڑی ہوئی شکل کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ ادبی زبانوں اور بول چال کی زبان کا فرق رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ (۶)

غلام حسن حیدرانی کے ناول "گھو" سے شروع ہونے والا سلسلہ ظفر لاشاری کے سب سے پہلے شائع ہو کر کتابی شکل میں آنے والے ناول "نازو" اور منیر احمد علوی کے مختصر ناول " آنجڑیں رت جو پاٹریں تھی" کی اشاعت کے بعد ایک دہائی تک منقطع رہا۔ اس دوران میں سرائیکی میں ہونے والے تراجم نے اس صنف کو سہارا دیا جس کے نتیجے میں ۱۹۸۳ء میں دو ناول تخلیق ہو کر کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ ان میں ظفر لاشاری کا دوسرا ناول "پہاج" اور محمد اسماعیل احمدانی کا ناول "چھولیاں" شامل ہیں۔

ظفر لاشاری کا ناول "پہاج" کتابی شکل میں شائع ہونے سے قبل ماہنامہ "سرائیکی ادب" ملتان میں قسط وار شائع کیا گیا۔ یہ اقساط نومبر ۱۹۷۶ء تا دسمبر ۱۹۷۹ء کے شمارہ جات میں سامنے آئیں۔ ۱۹۸۳ء میں "پہاج" کی اشاعت عمل میں آئی۔ ناول "پہاج" میں سوکن کے روایتی روپ کو بھانے کی

کوشش کی گئی ہے اور چولستان کی منظر نگاری سرائیکی وسیب کی تہذیب و تمدن کی عکاس ہے۔ ناول کے اہم کرداروں میں نذر، مدھیاں، وزیر، ساگول، غزالہ اور راول شامل ہیں۔

ظفر لاشاری کے ناول پہاج کے بارے میں دلشاد کلانچوی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ناول پہاج کے مربوط پلاٹ، کامیاب کردار نگاری، حسین مناظر اور فطری مکالموں کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ظفر لاشاری کا یہ دوسرا ناول پہلے ناول نازو سے آگے نکل گیا ہے اور 'نقش ثانی بہتر کشد از اول' کی مصدق ہے۔ خاص کر سرائیکی زبان و بیان پر کافی توجہ دی گئی ہے۔ سرائیکی الفاظ و محاورات اور تشبیہات و استعارات میں جو اضافے کیے ہیں اس سے سرائیکی زبان کے سرمایے میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ پہاج یا سوکن کے کردار کو خوب نمایاں کیا گیا ہے۔ معاشرے کے اس فرد کے حوالے سے معاشرتی مسائل و مشکلات پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔''(۷)

''پہاج'' ایک سماجی ناول ہے جس میں المیہ اور طربیہ انداز کا ایسا امتزاج پایا جاتا ہے جسے ظفر لاشاری نے پوری مہارت سے تحریر کیا۔ کہانی کا تسلسل، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، جزئیات نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری اور زبان دانی نے اسے ایک معیاری ناول بنا دیا ہے جس کا ہر کردار حقیقی زندگی کا پرتو محسوس ہوتا ہے۔ ''پہاج'' کو ایم اے کی سطح پر نصاب کا حصہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ جس کے باعث ۱۹۸۳ء میں سامنے آنے والے اس ناول کو ۲۰۰۲ء میں اشاعت دوم کے طور پر بھی شائع کیا گیا۔

محمد اسماعیل احمدانی (۱۹۳۰ء۔۲۰۰۷ء) کا ناول ''چھولیاں'' ۱۹۸۳ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ یہ ناول روایتی انداز سے ہٹ کر انوکھی وضع کے علامتی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامتی انداز سے سامنے آنے والے اس تصوراتی ناول کو ''A. Symbolic Fantasy'' کہا گیا ہے۔ جس میں سرائیکی وسیب کے متعدد مسائل کو اجاگر کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ جدید انداز کے اس ناول میں نئی نسل کے نوجوانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا تردد کیا گیا ہے۔ ناول کے اسلوب میں خالص زبان کا استعمال اور انگریزی اصطلاحات کو سرائیکی زبان میں شامل کرنے کا منفرد تجربہ کیا گیا

ڈاکٹر اسلم عزیز درانی کے مطابق سرائیکی ناول رفتہ رفتہ روایتی راستے پر چل رہا تھا۔ اس کی اُٹھان میں خاص رنگ ڈھنگ نظر نہیں آتے تھے۔ ناول کا قاری سرائیکی ناول نگاروں سے مطمئن نہیں تھا کیونکہ سرائیکی ناول میں عالمی ادب کی صنف میں آنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ ابھی اردو کے ابتدائی ناولوں کی رفتار سے چل رہا تھا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اچھے اور بڑے ناولوں کی صنف میں شامل ہونے کے لیے ایک عرصہ درکار ہے اچانک اسماعیل احمدانی کا ناول "چھولیاں" سامنے آگیا اور زبان و بیان، فکر و فن اور اسلوب کی ذخیروں منازل ایک ہی جست میں طے کر کے سرائیکی ناول کو اعلیٰ اور منفرد مقام دلانے کے ساتھ ساتھ سرائیکی زبان کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کر دیا۔ (۸)

محمد اسماعیل احمدانی نے اپنے ناول "چھولیاں" کے ذریعے دو نسلوں کی کہانیاں پیش کی ہے۔ اس کہانی میں ایک نسل ستہ دا خوند احمد خان کی شکل میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد نئی نسل کے نمائندے منصور کو ذمہ داریاں سونپ دیتا ہے جس سے نئی نسل کی "پگ" منصور کے سر آجاتی ہے۔ اس طرح استادا خوندی جاری ہوئی شمع روشن رہتی ہے اور یہ شمع بنا کا درس دیتی ہے۔

"چھولیاں" کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان نے اس ناول کو سالانہ ادبی ایوارڈ "خواجہ فرید ایوارڈ" سے نوازا۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے طالب علم ملک محمد اقبال محلو نے پروفیسر محمد سلیم ملک کی زیر نگرانی ۸۳۔۱۹۸۱ء کے سیشن میں ایم اے اردو کے مقالے کے طور پر "چھولیاں" کا اردو ترجمہ "لیریں" کے عنوان سے کیا۔

محمد اسماعیل احمدانی کا دوسرا ناول "امر کہانی" کے عنوان سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں بھی سرائیکی فکر کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں:

> "محمد اسماعیل احمدانی کا دوسرا ناول "امر کہانی" سرائیکی فکر و ادب کے صدیوں پر محیط ارتقائی عمل کی ورق ورق داستان اور فکری و ادبی تاریخ کی دستاویز ہے۔ اس کی نمایاں خوبی اس کا نظریہ سرائیکیت ہے۔ مصنف نے سرائیکی تحریک کے احیا اور ارتقا کی کہانی بیان کی ہے اور اس مقصدی ناول کا مقصد شعور سرائیکیت کی رفتار کو تیز کرنا ہے۔" (۹)

"امر کہانی" کو دستاویزی ناول کہا گیا ہے۔ جس میں فکری و ادبی تاریخ کو محفوظ کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب سرائیکی ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخ کی ایسی دستاویز ہے جس میں

سرائیکی زبان کی شناخت واضح کرتے ہوئے ماضی کی تہذیب، حال کے معمولات اور مستقبل کے امکانا
ت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

"امرکہانی" کو ایسی کہانی کے انداز میں پیش کیا گیا ہے جو کہانی کہنے والا الاؤ کے گرد بیٹھے لو
گوں کو سنایا کرتا تھا۔ یہاں پر فرق یہ ہے کہ کہانی کہنے والا کوئی ایک شخص ہے بلکہ آگ تاپنے کے لیے
چاروں اور بیٹھے لوگ کہانی کے کرداروں میں شامل ہیں۔ یہ کردار اپنے اپنے انداز میں کہانی کو آگے بڑھا
نے میں مصروف کار نظر آتے ہیں۔ بظاہر ایک رات میں پیش ہونے والی اس کہانی کی بنیاد داستان کی
طرح تخیل، رومان و فوق الفطرت عناصر پر نہیں ہے بلکہ اس میں زندگی کی ہو بہو تصویر پیش کی گئی ہے۔ جو
ایک خاص ذہنی رجحان کے زیر اثر لکھی گئی ہے اور اس میں ربط و یک رنگی موجود ہے۔ الاؤ کے گرد بیٹھے ہو
ئے کچھ درویش سرائیکی تہذیب و تمدن سے سرائیکی زبان، ادب اور سیاسی امور تک کو زیر بحث لاتے ہیں

محمد اسماعیل احمدانی سے پہلے سرائیکی ادب میں اس انداز کی تحریریں سامنے نہیں آئی ہیں۔ عنا
صر ترکیبی کے حوالے سے روایتی ناول سے مختلف ہوتے، بعض مقامات پر اساطیری انداز تحریر کی جھلک
نظر آنے اور ادبی و ثقافتی دستاویز میں جھول ہونے کے باعث تحفظات کا اظہار کیا جانا اچنبھے کی بات نہیں
ہے۔ اس کے باوجود امر کہانی کی کہانی اس انداز سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں سرائیکی
وسیب، زبان اور ادب کا ماضی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ حال کو پرکھنے اور مستقبل پر نظر رکھنے کی بات خو
ب صورت پیرایے میں سامنے آئی۔ گویا تہذیبی، لسانی اور ادبی رنگ کی کہانی کو ہیئت اور اسلوب کے
منفرد انداز سے پیش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی جسے سرائیکی ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت حا
صل ہے۔

فیاض حسین ناصر فریدی کا ناول "ساول" ۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آیا۔ سرائیکی معاشرے کی
اونچ نیچ، زن، زر اور زمین کے باعث بھائیوں کے درمیان ہونے والی غلط فہمیاں اور رسم و رواج خصوصاً
وٹہ سٹہ کی رسم کے اثرات اس ناول کے اہم موضوعات ہیں۔ اس ناول میں شامل قیام پاکستان کے حالا
ت و واقعات نے تاریخی رنگ بھی بھر دیا ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے عمل سے ہونے والے فسادات کی خو
نچکاں داستانیں تو پاکستانی زبانوں کے متعدد ناولوں میں بیان کی گئی ہیں لیکن اس ناول میں مہاجرین سے
پیش آنے والے واقعات میں انسانیت کی بلند اقدار جلوہ افروز ہیں۔ جابجا اخلاقی درس اور اصلاحی
اشارے ملتے ہیں۔ سرائیکی وسیب میں پائی جانے والی محرومیوں کے ازالے پر زور دیا گیا ہے۔ جا

گیرداروں کے منفی کردار کے ساتھ ساتھ مثبت گوشے بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کے قیام کے بعد وسیب خصوصاً بہاول پور میں اٹھنے والی فکری تحریک کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان سب کے باوجود مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ناول جس انداز سے پیش کیا گیا اسے ایک معاشرتی ناول کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

۱۹۹۱ء میں شائع ہونے والا دلشاد کلانچوی (۱۹۱۵ء۔۱۹۹۷ء) کا ناول "سارے سکھن سہا گڑے" (خوشیوں بھرے سارے شگون) اپنے عنوان کی مناسبت سے طریقہ ناول کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس ناول کی کہانی دلشاد کلانچوی کی اپنی بستی کلانچ والہ سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کا اختتام بھی اسی بستی پر ہوتا ہے۔ اس ناول میں معاشرے کی اصلاح کا پہلو نمایاں ہے جس کے باعث اسے معاشرتی اور اصلاحی ناول کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول کا سب سے اہم کردار اسی بستی کی لڑکی فوزیہ ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ سارا ناول فوزیہ کے کردار کے گرد گھومتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ فوزیہ تعلیم و تعلم سے منسلک ہے۔ شہر سے گریجویشن کی تعلیم حاصل کر کے واپس اپنے گاؤں آ جاتی ہے اور علاقے کے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی ٹھان لیتی ہے۔ علاقہ کے جاگیردار کئی قسم کی رکاوٹیں ڈالتے ہیں جنھیں وہ بااحسن عبور کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ بستی کے نمبردار کا بیٹا اسلم شیخ کا پیغام بھیجتا ہے لیکن فوزیہ اپنے منگیتر اور ان پڑھ چچازاد فیروز سے شادی کو ترجیح دیتی ہے۔ شادی کے بعد فیروز کو پڑھا لکھا کر نہ صرف مفید شہری بننے میں معاونت کرتی ہے بلکہ بلدیاتی انتخابات میں حصے لینے کا مشورہ دیتی ہے۔ فوزیہ کی مشاورت سے فیروز اپنی بستی کے نمبردار کو انتخابات میں شکست دے کر کامیاب ہو جاتا ہے۔

شوکت مغل نے دلشاد کلانچوی کے ناول لکھنے کی غرض و غایت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "ناول کو زندگی کی حقیقی کہانی کہا جاتا ہے اور یہی ایک اچھے ناول کی خوبی ہے۔ مصنف نے ناول میں کسی فرضی قصے کی بجائے معاشرے کے ایک سچے اور حقیقی پہلو کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے دیہات کے مسائل، وہاں کے وڈیروں اور نمبرداروں کی سوچ، زمینداروں کی بگڑی ہوئی خودسر اولاد، بستیوں میں تعلیم کی کمی جیسے مسائل کو پیش کیا ہے۔ ناول کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے بستیوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی کے رجحان کو روکنے کی کوشش کی

گئی ہے جو آج کے دور میں ہمارا بہت بڑا مسئلہ ہے۔"(۱۰)

دلشاد کلانچوی کا سرائیکی زبان و ادب کا معتبر حوالہ ہے۔ محقق، نقاد، مورخ، ماہر لسانیات، شاعر اور مترجم کے طور پر کئی کتب تحریر کیں۔ ان کے ناول "سارے سکھ سہاگ دے" میں روہی چولستان کی ثقافت کو بھرپور انداز میں پیش کیا گیا۔ سرائیکی معاشرے کے متعدد رنگ جس انداز سے پیش کیے گئے ان سے پورا ماحول واضح ہوتا ہے۔ رہن سہن، شیر و شکر ہونا، ٹوک جھونک کے سلسلے، عورت کی بیچ سے محبت، خوزیہ کی شکل میں عورت کی شخصیت، دیہات میں سکول کھولنے سے جاہلیت کا خاتمہ، مقدر کے سکندر کی تلاش، من مندر کی باتیں، رسم و روایت، نمبرداری نظام، سیلاب کی تباہیاں، انتخابات کی گہما گہمی لڑائی جھگڑے اور راضی نامے کے بارے میں وضاحت سے بات کی گئی ہے۔

غلام حسین راہی گبول نے افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول نگاری میں بھی نام کمایا۔ ان کا پہلا ناول "بھاگ سہاگ" ۱۹۹۳ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ جس میں ایک فرضی ریاست "روہستان" کا تصور پیش کیا گیا۔ "لگتا ہے ریاست روہستان کی کہانی دراصل چولستان یا بہاول ریاست بہاولپور کی کہانی ہے"(۶۹)۔ "بھاگ سہاگ" دورِ حاضر کے سیاسی و سماجی حالات سے متاثر ہونے والے پسے ہوئے معاشرے کی کہانی پیش کرتا ہے۔ جس میں سیاسی پارٹیوں کے احوال، انتخاب کے موقع پر امیدواروں کے عہد و پیمان، سیاسی جلسوں اور جلوسوں میں طلبہ کا کردار، ایک الیکشن سے دوسرے الیکشن تک پیش آنے والے واقعات شامل ہیں۔ ناول میں آخر تک دلچسپی قائم رکھنے کے لئے رومان کو بھی خوب نبھایا گیا ہے۔ اس ناول کے کرداروں میں فیصل محمود، نیا اور شیخ خصوصی اہمیت رکھتے ہیں جو کہ تصوراتی ریاست "روہستان" کی تعمیر و ترقی کے لیے دن رات ایک کر دیتے ہیں۔

راہی گبول کا دوسرا ناول "کونج" اکیسویں صدی کے دوسرے برس (۲۰۰۲ء) میں شائع ہونے کا پتا چلا (۷۰)۔ کونج ایک ایسا معاشرتی ناول ہے جس میں مصنف نے وسیب کے رسم و رواج کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے وسیب میں اس ناول کی طرح کتنی کہانیاں ہوں گی۔ جو بچپن میں کیے گئے رشتے کو چار و ناچار قبول کر کے زندگی کو روگ لگانے کا سبب بنی ہوں گی۔

دیہی زندگی کی ترجمانی کرتا ہوا یہ معاشرتی ناول اپنے شوخ کرداروں، سماجی تصورات، علاقائی منظر نگاری اور سادہ اسلوب کے باعث مصنف کے پہلے ناول کے مقابلے میں ارتقائی مراحل طے کر کے سامنے آیا ہے۔:

"ان کے کرداروں میں ماحول اور مناظر کی کشش پائی جاتی ہے۔ راہی گبول دیہی مناظر، معاشرت کی تصویر کشی اور کرداروں کی پیشکش میں پوری طرح کامیاب ہیں مگر جس وقت وہ اپنی کہانی کے کرداروں کو شہری زندگی میں لے جاتا ہے تو ان کے قلم کی روانی میں آورد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے"(۱۱)

راہی گبول کا تیسرا ناول "تجن دشمن" ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول کی ابتدا اس انداز سے ہوتی ہے کہ جن دوستوں پر ناز ہوتا ہے وہی دشمن کا روپ دھار لیتے ہیں اور انہی دشمنوں کا پھر سے دوست بن جانے پر ناول کا اختتام ہوتا ہے۔ گویا اس ناول میں جو دوست ہیں وہی دشمن بھی ہیں اور جو دشمن ہیں وہی دوست بھی ہیں۔ دراصل اس میں دیہات کی ایسی منظر کشی کی گئی ہے کہ جاگیر کی وراثت کے مسائل سامنے آتے ہیں جن کے باعث قتل و غارت، عدالتی حوالے، یتیم ہو کر گزر بسر کرنا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا، شہری زندگی کے اثرات، معاشرے میں پائی جانے والی تفریق، منہ بولے احباب کا تعاون، بعد مدت کے خون کا جوش مارنا اور دشمن کی مسیحائی کرنے جیسے متعدد واقعات ناول میں منفرد انداز سے پیش کیے گئے ہیں۔

راہی گبول کا چوتھا ناول "پردیس نہ ونج" ۲۰۰۷ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ رومانوی، اصلاحی اور خود احتسابی کے سلسلے کے اس ناول کا ایک اقتباس اسلوب کے علاوہ تہذیب و روایت کا بھی آئینہ دار ہے:

"رات کوں وستی دے میاں ندیم تے وڈے غلام رسول دے ڈیرے تے کٹھے تھئے تے کچہری لگی۔ روایت موجب سیٹھ اعظم تے چاچا غلام محمد دا ذکر تھیا۔ ساریں پہلے مہمانیں نال خیر خوش کیتی۔ سیٹھ صاحب تاں ایں رواج کوں نہ جاندا ہا پر چاچے غلام محمد سب نال ٹھیک ٹھاک خیر خوش کیتی۔ ول ہار کے حال منگیا۔ سیٹھ صاحب آکھیا۔ حال غلام محمد صاحب ڈیسن"(۱۲)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک دیہاتی ناول ہے جس میں پائے جانے والے کردار دیہات کے ساتھ ساتھ شہر سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور روایتی رسم و رواج کے علاوہ روزمرہ کے معمولات بھی عیاں ہیں۔ زبان قابلِ فہم اور انداز اصلاحی معلوم ہوتا ہے۔ گویا راہی گبول نے ناول کو زندگی اور انسان کی خدمت کا فریضہ سونپ رکھا ہے۔

Mir Zaheer Abass Rustmani
CamScanner

۲۰۱۳ء میں راشی گبول کا ناول "دلدار صدقے" ملتان سے شائع ہوا۔ اس ناول میں سرائیکی زبان، تخلیقی و تحقیقی ادب اور سرائیکی میں دی جانے والی تعلیم کے متعدد پہلو آسان اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شعبہ سرائیکی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے جریدہ "سوجھل" کی اشاعت دسمبر ۱۹۹۵ء میں ہوئی تو اس میں ارشاد تونسوی کے زیر ترتیب ناول "ڈیگر ویلا" کا پہلا باب بعنوان "ٹکل" سامنے آیا۔ اس قسط میں دامان کے علاقہ تونسہ اور اس کے مضافات کی تہذیب و ثقافت کو پیش کیا گیا ہے۔ موہنے انداز کے اسلوب کے پیش نظر اس ناول کا سرائیکی ادبی دنیا میں شدت سے انتظار کیا جاتا رہا۔ لیکن سالہا سال کے بعد بھی انتظار کی گھڑیاں ختم نہیں ہوئیں۔

۱۹۹۷ء میں سامنے آنے والا اقبال بانو (پ۔ ۱۹۶۱ء) کا ناول "ساؤل موڑ مہاراں" کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے ماہنامہ "سرائیکی ادب" ملتان میں قسط وار شائع کیا گیا۔

ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کے مطابق:

> "ساؤل موڑ مہاراں جسے "سرائیکی ادب" ملتان نے ۸۶۔۱۹۸۵ء میں قسط وار شائع کیا تھا۔ کسی خاتون ناول نگار کا پہلا مطبوعہ ناول ہے اس میں زمینداروں کے درمیان رشتہ داری کے جھگڑے، سوکنوں کے جلاپے اور سوتیلوں کے ظلم و ستم کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول کا ہیرو ایک زمیندار ملک رب نواز ہے جس کی پہلی بیوی ملانی سکینہ سے چار بیٹیاں، دوسری بیوی منظوراں سے دو بیٹیاں، تیسری بیوی حلیمہ سے دو بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک مجذوب کے کہنے پر کہ پہلی نظر آنے والی کنواری لڑکی سے شادی کرنے پر جائیداد کا وارث ملے گا، چوتھی شادی مزارع کی تیرہ سالہ بیٹی صغراں سے ہوتی ہے جو علی نواز کو ایک بیٹا دے کر مر جاتی ہے۔ ناول قسط وار لکھے جانے کی وجہ سے غیر مربوط ہو گیا ہے۔ پلاٹ کسا ہوا نہیں بلکہ پھیلا ہوا ہے اور کرداروں کی بھرمار بھی ہے۔ تاہم خواتین کے جذبات کی عکاسی اور مختلف مقامات پر منظر نگاری خوب ہے"(۱۳)

اقبال بانو کا ناول "ساؤل موڑ مہاراں" سرائیکی میں لکھا گیا کسی خاتون کا پہلا ناول ہے۔ یہ ناول جاگیرداری نظام کا ترجمان ہے اور اس کا بنیادی کردار ملک رب نواز ہے جو کہ ملک نواز کا بیٹا اور

ملک اللہ نواز کا چھوٹا بھائی ہے۔ ملک رب نواز کی شادی اپنے خاندان میں نگہت سے ہوتی ہے جس کے بطن سے چار بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جائیداد کے وارث کی خواہش کے باعث دوسری اور تیسری شادی بھی کرتا ہے لیکن کسی سے بھی نرینہ اولاد حاصل نہیں ہوتی۔ بالآخر ایک مزارع کی کم عمر بیٹی صغریٰ سے چوتھی شادی کر لیتا ہے تب جا کر جائیداد کا وارث علی نواز پیدا ہوتا ہے لیکن علی نواز کی پیدائش پر اس کی ماں صغریٰ اس جہان سے کوچ کر جاتی ہے تو اس طرح علی نواز کی پرورش کے دوران میں کئی مسائل جنم لیتے ہیں۔ ملک رب نواز کی بھابھی یعنی اللہ نواز کی بیوی نومولود کو زہر دینے کی کوشش میں ناکام ہوتی ہے۔ وہ اپنے بیٹوں کے لیے رب نواز کی بیٹیوں کے رشتے بھی مانگ لیتی ہے تاکہ گھر کی جائیداد گھر میں رہے اور علی نواز کو بھی اپنی سوتیلی بہنوں سے دور رکھنے کے جتن ہوتے ہیں۔ سوتیلی بہنیں اپنے بھائی پر قربان ہو جاتی ہیں اور شادی بھی نہیں کرتیں۔ حالات کے پیش نظر دونوں بھائیوں کے گھرانوں میں رنجشیں بڑھتی رہتی ہیں اور یہ رنجشیں اس وقت جا کر ختم ہوتی ہیں جب علی نواز بڑا ہو کر اپنے چچا اللہ نواز کی بیٹی مائرہ سے شادی کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر سلطانہ بخش نے "سانول موڑ مہاراں" کے بارے میں کتابی شکل میں سامنے آنے سے قبل اور قسط وار اشاعت کے بعد اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

> "اقبال بانو نے جاگیردارانہ معاشرے کی منفی روایتوں کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں کہانی ایک جاگیردار کے بڑھاپے سے شروع ہوتی ہے اور اس کے پوتے علی نواز پر ختم ہوتی ہے۔ جائیداد کے لیے وارث کا حصول اس کہانی کا مرکزی خیال ہے جسے مصنفہ نے حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔"
>
> (۱۳)

اقبال بانو کا دوسرا ناول "ایویں کوئی زال نہ ڈیکھے" بھی ماہنامہ "سرائیکی ادب" ملتان کے صفحات پر قسط وار شائع ہوا ہے لیکن تین دہائیوں سے زیادہ مدت بیت جانے کے باوجود کتابی شکل میں سامنے نہیں آ سکا۔ اس ناول میں دیہی علاقوں کے رسم و رواج کے علاوہ شادی بیاہ کے حوالے سے تعلیم یافتہ بچیوں کے روایت شکن احوال شامل ہیں۔ ناول میں شہری ماحول کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ سکول اور کالج کی شب و روز کے اطوار کو منفرد انداز سے پیش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ کالج میں پڑھنے والی دو سہیلیوں کے درمیان ہونے والے مکالمے کو قسط نمبر ۹ (اکتوبر ۱۹۸۸ء) سے لیا گیا ہے:

"یار انیلا! توں اتی مصروف رہندی ہیں ول وی ہیڈ دے جو کلز
کیویں مکمل تھی ویندے ہن؟
اے ہک راز ہے۔ انیلا نے اکھیں بند کر کے آکھیا۔
کیا اللہ دین دا چراغ ہتھ آ گئے؟
آف کورس۔۔۔ انیلا نے چٹکی بجائی۔
سچ ڈس نہ کیویں کریندی ہیں توں؟۔۔؟ مارے تجسس دے ناہید
دی حالت الجھن والی ہئی۔
توں کہیں کوں ڈسیسیں تاں ناں؟
اسکول ٹائم توں اساڈی دوستی ہے چار سال تاں تھی گئے ہن کڈاہیں تیکوں شکا
یت تھئی؟ ناہید نے شکایت دے انداز وچ آکھیا۔۔۔ اتے واقعی اے سچ ہا جو او
سکول توں انیلا دی بہترین دوست ہئی۔ حالانکہ انہیں دے مشاغل بہوں انج
ہن۔ ناہید بہوں پڑھاکوں ہئی اتے انیلا تاں پڑھائی چوروں ول وی امتحاں دی
دوستی چلدی پئی ہئی۔ ول انیلا نے اوکوں ڈس ڈتا۔
میکوں شکیل بھائی جرنل بنا کے ڈیندے ہن۔
کوئی چکر وکر تے نہیں۔۔۔؟ ناہید دیاں اکھیں اچ قسم دے ڈیو
دے جلدے بجھدے پئے ہن"۔(۱۵)

۲۰۰۰ء میں جمشید کلانچوی اعوان (پ۔۱۹۵۳ء) کا ناول "جھوکاں تھیسن آباد ول" اشاعتی مراحل طے کر کے سامنے آیا۔ جمشید کلانچوی اعوان کو ادبی ذوق وراثت میں ملا۔ ان کے والد دلشاد کلانچوی اور چھوٹی بہن مسرت کلانچوی نے سرائیکی ادب میں خوب نام کمایا۔ ارشاد تونسوی نے دلشاد کلانچوی، مسرت کلانچوی اور جمشید کلانچوی کو کلانچ والہ کی تثلیث قرار دیا(۸۱)۔ جمشید کلانچوی کے ناول میں چولستان کا ایک ایک منظر اپنی پوری آب وتاب سے شامل ہے۔ صحرا اور صحرا نشینوں کی معاشرت، بے آب وگیاہ روہی کے خدوخال دیہاتی وشہری زندگی کا فرق اور آئے روز پیش آنے والے گونا گوں مسائل اس ناول میں متوازن طور سے پیش کر دیئے گئے۔ ناول میں شامل واقعات مربوط انداز میں اس طرح سامنے لائے گئے کہ ان پر حقیقی زندگی کا گماں ہوتا ہے۔ گو کہ جمشید کلانچوی کی یہ پہلی ادبی کاوش

ہے لیکن ادبی ماحول ورثے میں ملنے کے باعث ایسے لگتا ہے کہ وہ ادب میں نووارد نہیں۔

"جھوکاں تھیسن آباد دواں" کے پلاٹ کے حوالے سے ڈاکٹر اسلم عزیز درانی کا خیال ہے کہ پلاٹ پیچیدہ نہیں بلکہ سادہ ہے مگر ناول کا پلاٹ بڑی خوش اسلوبی سے تیار کیا گیا ہے۔ کہانی اپنے آپ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کہانی میں مصنف کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ واقعات سے واقعات نکلتے ہوئے ہیں ان کا آپس میں منطقی ربط ہے۔ کہانی میں سسپنس بھی موجود ہے جو کہ قاری کے لیے دلچسپی کا سبب بنا ہوا ہے۔ کہانی ہر قدم، ہر موڑ پر مصنف کی گرفت میں رہ جاتی ہے۔(۱۲)

جمشید کلانچوی اعوان کے ناول کا پلاٹ مربوط اور خوبصورت ہے۔ کردار نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ مہرو کے مثالی کردار کے علاوہ دیگر کردار بھی معیاری ہیں۔ مکالمہ نگاری کا جواب نہیں۔ منظرکشی، جذبات نگاری اور جزئیات نگاری سے روزمرہ زندگی سانس لیتی نظر آتی ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ جمشید کلانچوی اعوان کے ناول میں شامل مثالی کردار "مہرو" کے بعد اقبال حسن بھپلا (۱۹۴۳ء۔ ۲۰۰۹ء) کا مختصر ناول سامنے آیا جس کا عنوان "مہرو" ہی ہے۔ اقبال حسن بھپلا نے مختصر ناول (ناولٹ) کے حوالے سے ایک نہیں، دو نہیں، تین ناول یکے بعد دیگرے لکھ کر شائع کرا دیے:

۱۔ مہرو ۱۰۳ صفحات ۲۰۰۲ء
۲۔ بستی ۹۶ صفحات ۲۰۰۶ء
۳۔ مانگ محل ۹۳ صفحات ۲۰۰۷ء

ناول "مہرو" میں مہرو کا کردار ہیروئن کا ہے جو ایک بنجارن ہے اور اس کے خاندان کے لوگ فقیر کہلاتے ہیں مرد کتوں کے شکار کو اپنی دنیا سمجھتے ہیں اور خواتین بھیک مانگنے پر اکتفا کرتی ہیں لیکن مہرو نے چوڑیاں بیچنے کو اپنا پیشہ بنایا ہوا ہے۔ اس خاندان کا ایک بگڑا ہوا نوجوان ساون پہلوان کے طور پر جانا جاتا ہے اور مہرو اسی ساون پہلوان سے منسوب ہے۔ ناول کا ہیرو "بالا" جوگیوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور بالا جوگی بھی کشتی لڑنے کا ماہر ہونے کے ناطے پہلوان کہلاتا ہے۔

"ساون" اور "بالا" کی ایک کشتی میں "بالا" جب اپنے داؤ پیچ سے "ساون" کو چاروں شانے چت کر دیتا ہے تو "مہرو" اس کی دیوانی ہو جاتی ہے۔ یوں اس ناول میں "مہرو" اور "بالا" کی محبت کی منفرد داستان رقم کی گئی ہے۔

اقبال بھپلا کی اس تخلیق میں جہاں دو پیار کے پروانوں کی داستان محبت رقم کی گئی ہے۔ وہاں

CamScanner

سماج کے دو مختلف خانہ بدوش گروہوں کے رسم و روایات کو منفرد انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے ذاتی مشاہدات کی روشنی میں ملتان کے مضافات میں شامل اپنے علاقے، اس میں پائے جانے والے جنگلات اور دریائے چناب کے دونوں کناروں کی تہذیبی روایات کو اجاگر کیا ہے۔ ناول کے اختتام پر ملتان شہر کے تاریخی و ثقافتی حوالوں کو شعوری طور پر سامنے لانے کی کوشش کی گئی۔

اقبال حسن بھپلا کا دوسرا ناول "بشتی" سرائیکی ریسرچ سنٹر، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی جانب سے شائع کیا گیا۔ ان کے ناول "مہرو" کی طرح اس ناول کے لیے جو علاقہ خصوصی اہمیت رکھتا ہے وہ ملتان سے مغرب کی جانب دریائے چناب کا کنارا ہے اور انیسویں صدی عیسوی کے اختتامی عناصر کا تذکرہ ہے۔ اس ناول میں جھوک جنان کو محور بنایا گیا ہے اور ناول کی ابتدا علاقے کے تعارف کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیب و تمدن کو واضح کرنے سے کی گئی ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد اور اجمل مہار کے تحریر کردہ پیش لفظ میں ناول "بشتی" کو سرائیکی دھرتی کی تہذیب اور کلچر کا نمائندہ ناول کہا گیا ہے جس میں سرائیکی وسیب کے دیہاتی کلچر کی پوری جھلک نظر آتی ہے۔ اس ناول کے ہر اقتباس میں سرائیکی دھرتی کے رسم و رواج، لوگوں کا رہن سہن، ان کے رویے، ان کی نفسیات اور عوامی شعور کی پوری جھلک نظر آتی ہے۔ (۸۶)

مذکورہ ناول کا پلاٹ سادہ مگر مربوط ہے۔ وسیب کے کرداروں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے کردار بھی سرائیکی وسیب کی تہذیب و ثقافت کو اجاگر کرنے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ مصنف نے شاعری کو ناول کا حصہ بنا کر انفرادیت ضرور پیدا کی ہے اور متعدد مواقع پر کرداروں کی مناسبت سے گانے بجانے میں مستعمل شاعری نے حسن بھی پیدا کیا ہے لیکن بعض مقامات پر شعری رنگ ضرورت سے زیادہ ہونے یا موقعے کی مناسبت سے نہ ہونے کے باعث پھیکا بھی پڑ گیا ہے۔ مجموعی طور پر "بشتی" میں حسن و عشق پر آنے والے امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں اور اسے ایک کامیاب رومانوی اور معاشرتی ناول کہا جا سکتا ہے۔

اقبال حسن بھپلا کا ناول "ماتک لعل" ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ یہ تیسرا ناول بھی ملتان اور اس کے مضافات کی نمائندگی کرتا ہے اس ناول کی کہانی دریائے چناب کے کنارے آباد مثال پور سے شروع ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری کے ناول "بیڑی وچ دریا" میں ملتان کی صدیوں پر محیط تاریخ کو محفوظ کر

نے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ ناول کا ہیرو "ساتول" دریا کے کنارے آباد ہوتے ہوئے اپنے دوست اور ملتان کے باسی سارنگ کے لیے جان کی بازی لگا دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔

"بیڑی وچ دریا" کا انداز بیان دلکش اور قدیم زمانے کے عوامی لہجے کا ترجمان ہے۔ شہری زندگی کے مناظر خوب ہیں۔ ناول کے پہلے حصے میں ڈیڑھ سو سال قدیم ملتان کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مول راج کے عہد میں ساتول کی گواہی کے باعث سارنگ کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے اور اسے قید سے رہائی ملتی ہے۔ مول راج کے بعد رنجیت سنگھ کا ملتان کے باسیوں سے بیجا سلوک واضح کیا گیا ہے۔ بعد ازاں ۱۸۴۹ء کے ملتان کا احوال شامل کیا گیا ہے جب انگریزوں نے ملتان پر قبضہ کر لیا تھا۔

حفیظ الرحمن خان کی رائے میں "بیڑی وچ دریا" کے کردار سر نگیں دیب خاص طور پر ملتان کی تہذیبی روایات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ کچھ تو افسانوی کردار ہیں اور کچھ حقیقی و تاریخی نوعیت کے حامل ہیں۔ افسانوی کردار کہانی کے ماحول میں رچے بسے ہوئے ہیں جنھیں ڈیڑھ سو سال کے جیتے جاگتے لوگوں کے ملتان کی تہذیب کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔ تاریخی کرداروں اور مقامات کو ناول نگار نے مہارت اور جابکدستی سے کہانی کا حصہ بنایا ہے۔ جن کے باعث ملتان کی تاریخ، تہذیب اور معاشرت کا ایک سچا مرقع ہماری نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ افسانویت اور حقیقت کا یہ حسین امتزاج ناول کی فنی اور موضوعاتی اہمیت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ (۱۸)

ڈاکٹر اسلم عزیز درانی نے "بیڑی وچ دریا" کے مکالموں (خاص طور پر پہلے حصے کے) کو فطری اور کرداروں کی شخصیت کے عین مطابق قرار دیا ہے۔ مکالمے کہانی کو آگے بڑھانے کا سبب ہیں۔ مکالمے مشکل اور حسن سے عاری نہیں۔ مکالموں میں زندگی کی رمق موجود ہے جو کرداروں کی فطرت، مزاج اور شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس ناول کا سارا حسن و دلکشی مکالموں میں موجود ہے۔ (۱۹)

ڈاکٹر اسلم انصاری کے ناول کی اہمیت کے پیش نظر پروفیسر عطا اللہ اعوان نے "کشتی میں دریا" کے عنوان سے اسے اردو روپ دیا جسے ماہنامہ "سچ تک" لاہور نے دسمبر ۲۰۰۵ء میں خصوصی نمبر کے طور پر شائع کیا۔ ملتان کے تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں پر لکھے گئے اس ناول کے اردو ترجمے کے اختتامی الفاظ کچھ یوں بیان کیے گئے ہیں:

"بابا! یہ سانول خان کون تھا؟

وہ بھی ایک آدمی ہی تھا بیٹے۔ دریا کے پار سے آیا تھا۔

گل محمد نے اسے یہ نہ بتایا کہ اس سے اس کا بھی کوئی رشتہ تھا۔ اس آخری بات کو آدھی صدی گزر چکی ہے اس آدھی صدی میں اتنا کچھ ہو چکا تھا کہ اب قصہ کہنے والے کا بوڑھا دماغ ہی اس سب کچھ کو سنبھال سکتا ہے۔ سانول کا بھی اب قصہ گو کے سوا کسی اور کو یاد نہیں۔

آج کل اس تھکے ہوئے گھوڑوں والے احاطے کی جگہ پر ایک پلازہ کھڑا کیا جا رہا ہے کسی کو کیا معلوم کہ اس پلازہ کے کنکروں کے فرش کے نیچے کس کس کے خواب چکنا چور ہو کر رہ گئے ہیں۔" (۲۰)

کالا نیچی خاندان کے نوجوان لکھاری عون محمد کالا نیچوی کی تحریر "مجرم۔۔۔۔؟" کے عنوان سے سامنے آئی۔ ۲۰۰۸ء میں بہاول پور سے شائع ہونے والی اس تحریر کو ناولٹ کا نام دیا گیا ہے۔ ۳۲ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ ایک جاسوسی کہانی پرچی ہے جسے ایک طویل افسانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کاشف بلوچ کی تحریر "پھوگ" جسے بعض ناقدین ادب نے سرائیکی ناول کی ذیل میں رکھا ہے۔ جس میں مصنف نے رپورتاژ یا روداد کے انداز میں اپنی بات کو آگے بڑھایا ہے اور بات بات پر نہایت سطحی، مبتذل اور بازاری زبان کا استعمال کیا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر اسلم عزیز درانی اسے نہ صرف ادبی شہ کار ماننے کو تیار ہی نہیں۔ بقول ان کے سرائیکی میں اس قدر فحش اور عریاں تحریر نہ پہلے لکھی گئی ہے نہ آئندہ لکھی جائے گی" پھوگ" چوں کہ ناول ہی نہیں ہے اس لیے یہ سرائیکی ناول کی تاریخ میں کوئی مقام نہیں رکھتا (۲۱)۔

"پھوگ" کا لفظ اس چھلکے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس سے رس نچوڑ لیا جائے خواہ وہ گنے کے چھلکے ہوں یا دیگر پھلوں کے خشک، بے جان اور بے ذائقہ چھلکے جو محض ایندھن کے کام آ سکتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ "پھوگ" درحقیقت ایک عہد کے بے رنگ اور پھیکے پہلوؤں کو پیش کرتا ہے جو فرد کی معاشی، تعلیمی اور تہذیبی سطح کی عکاسی کرتا ہے۔ سیاسی زندگی کے خلفشار، سماجی زندگی کے انحطاط، تہذیبی تصادم اور کشمکش کے زمانے میں جہل و افلاس کے جنگل میں جکڑے ہوئے ایسے بے بس انسان جن کا احساس کند اور شعور مفلوج ہو چکا ہو۔ کاشف بلوچ ان کی زندگیوں کو پھوگ کی صورت میں لیتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو سستی اور جعلی زندگیوں پر یہ ایک سفاکانہ طنز ہے مگر اس طنز کو ادبی حوالے سے بھی

سامنے لایا جا سکتا تھا۔

حبیب موہانہ کی تخلیق "اللہ لیسی موہجھاں" اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کا اہم ترین سرائیکی ناول سمجھا جاتا ہے۔ ۲۰۱۰ء میں چھپ کر سامنے آنے والا یہ ناول اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے سالانہ "خواجہ فرید ایوارڈ" کا حق دار ٹھہرا۔ "اللہ لیسی موہجھاں" ڈیرہ اسماعیل خان کے مضافات کی ایک کہانی ہے۔ جس میں سرائیکی وسیب بالعموم اور دمان کا خطہ بالخصوص سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی سے اکیسویں صدی کے آغاز تک کی تہذیبی روایات، دیہات کے مناظر اور پُر خلوص محبت کے بکھرے بکھرے رنگ ناول میں واضح نظر آتے ہیں۔

"اللہ لیسی موہجھاں" کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک قلم کار حفیظ گیلانی کا ناول "بہت گھر لاوے کونج" کے عنوان سے ۲۰۱۲ء میں سامنے آیا۔ اس ناول میں عمومی طور پر خطہ دامان اور خصوصی طور پر ڈیرہ اسماعیل خان کی تہذیب و ثقافت کے خدوخال کو قیام پاکستان کے بعد کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ خطہ دامان کے ثقافتی، سماجی اور معاشرتی پس منظر میں لکھے گئے اس ناول میں قاری کے ذوق کی تسکین کو نصب العین بنایا گیا۔ جس کی زبان منجھی ہوئی اور سلجھی ہوئی ہے نیز انداز بیان بھی سادہ اور عام فہم ہے۔

۲۰۱۲ء ہی میں سامنے آنے والا سلیم شہزاد کا ناول "گماں" نئی تکنیک سے پیش کیا گیا جس میں بیانیہ انداز کے ساتھ ساتھ علامتی رنگ اپنانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ ناول کے انگ میں پاکستان کی مجموعی موجودہ صورت حال واضح نظر آتی ہے جس میں پاکستان کی خارجہ پالیسی، داخلی حالات اور دیگر سیاسی و سماجی امور کو موضوع بنایا گیا ہے۔

"گماں" کے کرداروں میں پکھیرو، بھڑ اور زہری خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ پکھیرو کا علامتی کردار تیسری دنیا کے پسماندہ عوام کا آئینہ دار ہے۔ بھڑ کو دہشت گردی کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جب کہ زہری کو محب وطن شہری کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گویا یہ کردار عالمی حیثیت کے حامل ہیں۔

اشرف جاوید ملک کا ناول "پاندھی" ملتان کی قدیم تہذیب سے عصر حاضر تک کے احوال کو سامنے لانے کی کاوش ہے جس میں تاریخ و ثقافت کے ملے جلے رنگ شامل ہیں مصنف کا تعلق بھی ملتان سے ہونے کے باعث کتاب کا بیشتر حصہ قلم کار کی اپنی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔

۲۰۱۸ء میں محمد حفیظ خان نے ناول نگاری میں قدم رکھا۔ قبل ازیں افسانوی ادب کے حوالے

سے وہ افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ محمد حفیظ خان کا ناول "ادھ ادھورے لوگ" بہاول پور کی تاریخ و ثقافت کا ترجمان ہے۔ جس میں ون یونٹ کے قیام سے بہاول پور کی تہذیبی و ثقافتی پہچان ختم کرنے کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ یہ ناول فرضی کرداروں کے ذریعے حقیقی تاریخی تناظر میں تحریر کیا گیا ہے۔ محمد حفیظ خان نے اپنے اس ناول کو اردو ترجمے کے طور پر بھی "ادھ ادھورے لوگ" کے عنوان سے پیش کیا ہے ترجمہ کیے گئے ناول کے پس ورق پر اس ناول کا مختصر تعارف یوں دیا گیا ہے:

> "ون یونٹ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا سیاہ باب کہ جس کے سبب حکمران ذہنی ساخت نے بیک جنبش قلم محکوم لسانی ثقافتوں سے ان کی تمام تر تہذیبی، تاریخی اور جغرافیائی پہچان سازشاً چھین کر اپنی غاصبانہ تحویل میں لے لی۔ صدیوں سے اس خطے میں رہنے والے کروڑوں لوگ شب بھر میں اپنی شناخت کے بحران میں یوں مبتلا کیے گئے کہ زندہ رہنے کا ہنر تک بھلا بیٹھے۔ 'ادھ ادھورے لوگ' بپتا ہے ریاست بہاول پور میں جنم لینے والے فیاض جیسے ان بدقسمت کرداروں کی، جن کی زندگی محض اس لیے بھی نہ پوری ہونے والی خواہشوں کی بھینٹ چڑھ گئی کہ وہ تقسیم ہند کے مضمرات میں سے گزرتے ہوئے ون یونٹ جیسی سیاسی جکڑ بندی کے ٹوٹنے اور بہاول پور صوبہ بحالی کی امید میں اپنی غصب شدہ پہچان تلاشنے کے سفر پر نکلے تھے۔ (۴۴)

ارشاد العصر جعفری کا طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں تحریر کردہ ناول "چو پایا" ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا جس میں ہمارے معاشرے کے روزمرہ معمولات میں ہونے والے طنز و مزاح کو کہانی میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ سماج میں پائے جانے والے مختلف کرداروں میں سے والدین، طالب علم، استاد، دوست احباب، شاعر، سیاست دان، حکیم، پیر، جعلی پیر اور داستانوی کردار خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

۲۰۲۰ء میں سامنے آنے والی رفعت عباس کے ناول "لون دا جیون گھر" میں وادی سندھ کی قدیم تہذیب کی کہانی منفرد انداز میں پیش کی گئی ہے۔ جس میں نمک کی کان میں آباد شہر کا علامتی انداز اپناتے ہوئے ہزار ہا سال پہلے کی تہذیب کے ارتقائی مراحل کو خوب صورتی سے پیش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ اس ناول کو اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے "ڈاکٹر مہر عبدالحق ایوارڈ" ملنے کا اعزاز حاصل ہے۔

معروف صحافی اور قلم کار رضا میر لغاری کا ناول "وساخ" ۲۰۲۱ء میں لاہور سے شائع ہو کر سامنے آیا۔ اس ناول میں سرائیکی وسیب کی روایات کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی گئی۔ جس کے مطالعے سے بیسویں صدی کا جیتا جاگتا وسیب نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

شاعری اور افسانہ نگاری میں اپنی پہچان بنانے والے جاوید آصف نے ۲۰۲۱ء میں "دستیر" کے عنوان سے ایک معاشرتی ناول پیش کیا۔ جو ایک کردار کی کہانی ہے۔ جس کی بیوی کا جوانی میں انتقال ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی پرورش کے لیے بھی دوسری شادی سے انکار کر دیتا ہے لیکن جب اس کا بیٹا جوان ہوتا ہے تو وہ اپنے بیٹے کی عمر کی لڑکی سے شادی کرنے کے بارے میں بارہا سوچتا ہے لیکن اس کے اندر ایک خوف گھر کر لیتا ہے کہ اس شادی کی خواہش کا اظہار کرنے پر لوگ کیا سوچیں گے اور لوگوں کا ردعمل کیا ہوگا؟ گویا "دستیر" اسی قسم کے خوف اور وسوسے کو جنم دینے کی ایک کہانی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سجاد حیدر پرویز، ڈاکٹر، مختصر تاریخ زبان و ادب۔ سرائیکی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء، ص ۲۰۷

۲۔ دلشاد کلانچوی، سرائیکی اور اس کی نثر، بہاول پور: مکتبہ سرائیکی ادب، ۱۹۸۲ء، دوسری بار، ص ۱۹۷

۳۔ دلشاد کلانچوی، سرائیکی اور اس کی نثر، ص ۱۳۹

۴۔ انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، پنجابی ادب دا ارتقا (۱۹۴۷ء۔۲۰۰۳ء)، لاہور: عزیز بک ڈپو، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۷

۵۔ طاہرہ تونسوی، ڈاکٹر، سرائیکی زبان کا پہلا ناول ۔۔۔ نازو، مشمولہ: "ناز" از ظفر لاشاری، مترجم: حمید الفت ملغانی، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲

۶۔ اسلم عزیز درانی، ڈاکٹر، سرائیکی ناول نگاری، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۴

۷۔ دلشاد کلانچوی، سرائیکی اور اس کی نثر، ص ۱۵۹

۸۔ اسلم عزیز درانی، ڈاکٹر، سرائیکی ناول نگاری، ص ۱۰۶

۹۔ سجاد حیدر پرویز، ڈاکٹر، مختصر تاریخ زبان و ادب۔ سرائیکی، ص ۲۱۰

۱۰۔ شوکت مغل، دلشاد کلانچوی شخصیت اور فن، بہاول پور: اکادمی سرائیکی ادب، ۲۰۰۲ء، ص ۱۹۹

CamScanner

۱۱۔ اسلم عزیز درانی، ڈاکٹر، سرائیکی ناول نگاری، ص ۱۵۱

۱۲۔ راشد کھوکھر، پردیس نہ ونج، جھوک شریف (رحیم یار خان): جھوک سرائیکی تعلیمی ادارہ، ۲۰۰۹ء

۱۳۔ سجاد حیدر پرویز، ڈاکٹر، مختصر تاریخ زبان و ادب سرائیکی، ص ۳۱

۱۴۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، جلد اول، اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء، ص ۴۳۸

۱۵۔ اقبال بانو، اساں کوئی زل، چھیکڑی قسط ۶، ماہنامہ "سرائیکی ادب" ملتان، اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۲۳

۱۶۔ اسلم عزیز درانی، ڈاکٹر، سرائیکی ناول نگاری، ص ۱۲۰۔۱۲۱

۱۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر، پیش لفظ مشمولہ "کتھی" ملتان: سرائیکی ریسرچ سنٹر بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء، ص ۷

۱۸۔ حفیظ الرحمن خان، سرائیکی نقد و ادب، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۳۵

۱۹۔ اسلم عزیز درانی، ڈاکٹر، سرائیکی ناول نگاری، ص ۱۹۹

۲۰۔ ماہنامہ "پیچنگ" لاہور، دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۵۸

۲۱۔ اسلم عزیز درانی، ڈاکٹر، سرائیکی ناول نگاری، ص ۱۶۳

۲۲۔ محمد حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۸ء، بیک ورق

CamScanner

افسانہ

سرائیکی ادب میں افسانہ کی صنف اردو ادب سے آئی۔ سرائیکی افسانہ نگاری کے ابتدائی دور کا تعین مقصود ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ افسانے کا سفر ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستانی عہد میں شروع ہوا۔ لیکن اس سے قبل قصہ اور کہانی کی توانا روایت سرائیکی لوک ادب کی پہچان رہی جس نے سرائیکی افسانے کو بنیاد فراہم کی۔

۱۹۴۷ء کے واقعات سے جنم لینے والے سماجی اور اخلاقی مسائل نے انسان کو تذبذب کا شکار کر دیا۔ جس نے نہ صرف انسانی زندگی کا انداز بدل ڈالا بلکہ قلم کاروں کے قلم میں بھی جنبش آئی۔ پاکستانی ادب بالعموم اور سرائیکی ادب بالخصوص ان واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ شعری تخلیقات کے ساتھ نثری تخلیقات نے بھی بدلتے رجحانات و میلانات سے اثر لیا۔ لیکن رسائل و جرائد کے فقدان کے باعث نثری تخلیقات اشاعت کے مراحل طے نہ کر سکیں۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک کے تحریر کردہ افسانوں کے دستیاب مسودات کی ایک فہرست میں سرائیکی افسانوں کے کوائف حسب ذیل ہیں:

مصنف	عنوان	سال تحریر	مقام
آصف علی اوچوی	جھاڑ ورا نیلا	۱۹۴۸ء	اوچ شریف
مولوی کرم داد عرف دادا	اللہ لوک	۱۹۴۸ء	رحیم یار خان
نوران	دھرتی خداوی	۱۹۴۸ء	جھنگ
محمد اشرف راہی	سوالاں دی ول	۱۹۵۰ء	بچی کوٹھ (لیاقت پور)
وحید خان واحد	کنواری چھوہیر	۱۹۵۰ء	ہارون آباد
نور شاہ ذوقو	شاہ دی بادشاہی	۱۹۵۰ء	نواب شاہ

قیام پاکستان سے قبل رسالہ "العزیز" بہاول پور میں سرائیکی زبان و ادب کے چرچے اردو نثر کے ذریعے ہوتے رہے(۱) جولائی ۱۹۵۰ء میں سید علی شاہ ملتانی کی ادارت میں رسالہ"

وچند" نے کراچی سے اشاعت کا آغاز کیا جسے پہلا باقاعدہ سرائیکی رسالہ کہا جاتا ہے۔ ۳۲۔ صفحات پر مشتمل اس رسالے کے چھ شمارے سامنے آ سکے۔ (۲) اس رسالے کے دستیاب شماروں میں شاعری کو زیادہ اہمیت دی گئی اور نثری حوالے سے مضمون نگاری کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا۔ ۱۹۶۳ء میں ہفت روزہ "اختر" نے جھوک والا (ملتان) سے اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جس میں ماہانہ سرائیکی ایڈیشن بھی شائع ہوتا رہا (۲)۔ ہفت روزہ "اختر" کو مولانا نور احمد خان فریدی نے اپنے بڑے بیٹے اختر علی خان کے نام کی نسبت سے شروع کیا۔ بعد ازاں اختر علی خان بلوچ نے ہی ادارت کے فرائض سنبھالے۔ ۱۹۶۵ء میں سید نذیر علی شاہ کی ادارت میں سہ ماہی "سرائیکی" بہاول پور کی اشاعت عمل میں آئی (۳) تو سرائیکی ادب خصوصاً نثری تحریروں کو تقویت ملی۔ یوں ہفت روزہ "اختر" ملتان کے ماہانہ سرائیکی ایڈیشن اور سہ ماہی "سرائیکی" بہاول پور نے سرائیکی افسانے کی اشاعت میں مدد دی۔ دستیاب مواد کی مدد سے شائع شدہ ابتدائی افسانوں کا ریکارڈ یوں مرتب کیا جا سکتا ہے:

مصنف	عنوان	اخبار/رسالہ	تاریخ اشاعت
اقبال سوکڑی	شاداں (۳)	ہفت روزہ "اختر" ملتان	۱۹۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء
تحسین سبائے والوی	شہید	سہ ماہی "سرائیکی" بہاول پور	جولائی ۱۹۶۷ء
دلشاد کلانچوی	روہی دا ہک خواب	سہ ماہی "سرائیکی" بہاول پور	مارچ ۱۹۶۸ء
نجمہ کوکب	منگا	ہفت روزہ "اختر" ملتان	۲۳۔ جولائی ۱۹۶۸ء
تحسین سبائے والوی	سہارا	ہفت روزہ "اختر" ملتان	۲۳۔ اگست ۱۹۶۸ء
اختر علی خان بلوچ	ہوا	ہفت روزہ "اختر" ملتان	۲۳۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء
اختر علی خان بلوچ	روشنی بتری	ہفت روزہ "اختر" ملتان	یکم اپریل ۱۹۶۹ء
غلام حسن حیدرانی	کیری دی مُنھ	ہفت روزہ "اختر" ملتان	یکم جون ۱۹۶۹ء
نعیم ہریلا	پھل دی کہانی	سہ ماہی "سرائیکی" بہاول پور	اکتوبر ۱۹۶۹ء
ظفر اشاری	تاج محل	سہ ماہی "سرائیکی" بہاول پور	اکتوبر ۱۹۶۹ء
ظفر اشاری	دروین کھی	سہ ماہی "سرائیکی" بہاول پور	اکتوبر ۱۹۶۹ء

ہفت روزہ "اختر" ملتان کا ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء کا "افسانہ نمبر" یادگار ہے (۵)۔ جس میں غلام

حسن حیدرانی، محمد اسماعیل احمدانی، تحسین سبائے والوی، کیفی جام پوری، اقبال سوکڑی، سجاد بریلوی، اختر علی بلوچ، محمد رمضان طالب اور نجمہ کوکب کے افسانے شامل ہیں۔(۶)

دستیاب مواد کی رُو سے سرائیکی کا پہلا افسانہ تو اقبال سوکڑی کا شائع ہوا لیکن بعد ازاں اقبال سوکڑی نے اس صنف ادب کے بجائے سرائیکی شاعری کو اپنی تخلیقات کا اس قدر محور بنایا کہ سرائیکی شاعری خصوصاً غزل کے میدان میں خوب نام کمایا۔ اسی طرح دلشاد کلانچوی نے افسانہ نگاری میں قدم رکھنے کے باوجود تحقیق و تنقید کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ اختر علی خان بلوچ نے افسانے تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ صحافتی ذمہ داریوں پر بھرپور توجہ دی اور سرائیکی لکھاریوں خصوصاً خواتین کو افسانہ نگاری کی جانب راغب کرنے کے لیے "نجمہ کوکب" کے قلمی نام سے بھی افسانے لکھے(۷)۔ خرم بہاول پوری کے فرزند نعیم اربلا نے اس میدان میں قدم ضرور رکھا لیکن وہ اپنے قدم جما نہ سکے۔ البتہ ظفر لاشاری کے افسانے ۱۹۶۹ء میں شائع ہونا شروع ہوئے جنہوں نے بعد ازاں افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول نگاری میں اہم مقام حاصل کیا۔ ان ابتدائی افسانہ نگاروں میں غلام حسن حیدرانی اور تحسین سبائے والوی نے افسانے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا جس کے باعث یہ دونوں تحقیق کاروں کے اپنے اپنے طور پر اولین افسانہ نگار کے طور پر پہچانے جانے لگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرائیکی افسانے میں اولیت کے مسئلے نے اختلاف کی نوعیت اختیار کر لی۔ آخر کار اس اختلاف کے خاتمے کے لیے ڈاکٹر طاہرہ تونسوی نے ۲۰۰۰ء میں کچھ موجود ادیبوں اور دانشوروں سے رائے لینے کے لیے خطوط لکھے۔ ان خطوط کے جواب میں محمد اسماعیل احمدانی، انیس شاہ جیلانی، محمد اسلم رسولپوری، ظفر لاشاری، محمد اسلم میتلا، شوکت مغل، اسلم عزیز درانی، قاسم جلال، سجاد حیدر پرویز اور فیض بلوچ کے خطوط موصول ہوئے۔ جن میں دونوں افسانہ نگاروں کی اہمیت اجاگر کی گئی۔ ان خطوط میں سے محمد اسماعیل احمدانی کی رائے اہم ترین اور معتبر ترین قلم کار کے طور پر سب سے مقدم نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "سرائیکی افسانے کی نئی تکنیک سے معاشرتی مسائل کے بارے میں لکھنے والا پہلا افسانہ نگار غلام حسن حیدرانی ہے۔ البتہ یہ بات ضرور لکھی جائے تاکہ ریکارڈ درست رہے کہ تحسین سبائے والوی اس سے بھی پہلے کی پرانی تکنیک میں افسانہ نما کہانی اور کہانی نما افسانہ لکھتا رہا ہے۔ وہ افسانے کی پیدائش کا زمانہ تھا اس لیے اگر حیدرانی سرائیکی افسانہ کی ماں ہے تو تحسین سبائے والوی اس کی

ونّی ہے۔"(۸)

ظفر لاشاری کا نام ابتدائی افسانہ نگاروں میں شامل ہے۔ ان کا مضمون "سرائیکی افسانے دا ارتقا" ماہنامہ "سرائیکی ادب" ملتان کے مارچ ۱۹۸۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ جس میں تحسین سیالے والوی کا تذکرہ دیگر افسانہ نگاروں کی فہرست میں عمومی انداز سے کیا گیا ہے۔ جب کہ غلام حسن حیدرانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "سرائیکی ادب دی دھرتی اُتے افسانے دے ابّرے رکھن والیاں وچوں سردار غلام حسن خان حیدرانی مرحوم دا ناں ہمیشہ سب کنوں پہلے گھدا ویسی۔ حیدرانی سائیں ای سرائیکی دے او جاہندڑے افسانہ نگار ہِن جنہاں نہ صرف خود بہترین افسانے لکھیے بلکہ ڈوجھیاں کوں وی افسانہ نگاری دا شوق ڈیوایا۔"(۹)

اب تک کی معلوم اور دستیاب اشاعتی ترتیب کے مطابق تحسین سیالے والوی کا افسانہ "شہید" جولائی ۱۹۶۷ء میں سامنے آیا اور غلام حسن حیدرانی کا افسانہ "کیری دی تنخ" یکم جون ۱۹۶۹ء کو شائع ہوا۔

تحسین سیالے والوی (۱۹۴۳ء۔۱۹۸۹ء) کی اولین تحریر پاک بھارت جنگ ۱۹۶۵ء سے متاثر ایک رومانوی کہانی پر مشتمل ہے جسے کسی حد تک افسانہ کہا جا سکتا ہے لیکن جدید دکھاری غلام حسن حیدرانی (۱۹۳۲ء۔۱۹۷۵ء) نے "کیری دی تنخ" سے ہی ارد گرد کے ماحول اور ذاتی مشاہدات کو جس انداز سے افسانے کا روپ دیا۔ اس نے حیدرانی کو بڑا افسانہ نگار بنا دیا۔ اس تحریر میں شامل الفاظ اور موضوع پر دسترس کے باعث یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ غلام حسن حیدرانی کا پہلا افسانہ ۱۹۶۹ء میں شائع ضرور ہوا لیکن اس کا تخلیقی سفر کئی برس پر محیط ہونے کا قوی امکان ہے۔ بہر حال اس بات سے قطع نظر کہ پہلا افسانہ کس نے لکھا ہے۔ اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں کہ غلام حسن حیدرانی سرائیکی کا پہلا افسانہ نگار ہے جس نے لکھنے والوں کی ایک نسل کو متاثر کیا۔

۱۹۶۹ء کے بعد رسالہ "اختر" ملتان کی اشاعت کا سلسلہ بند ہو گیا (۱۰) لیکن اس رسالہ کے "افسانہ نمبر" اور سہ ماہی "سرائیکی" بہاول پور میں شائع ہونے والی تخلیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۶۹ء میں اس قدر افسانے چھپ کر سامنے آئے کہ یہاں سے سرائیکی افسانے نے ارتقا کا راستہ اختیار کر لیا۔

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ افسانے کے ارتقائی سفر میں رسائل و جرائد نے نمایاں کردار ادا کیا

۔نومبر ۱۹۷۱ء میں ماہنامہ "سرائیکی ادب" ملتان کا اجرا سرائیکی افسانے کے لیے نیا موڑ ثابت ہوا۔ اس طرح ملتان سے ماہنامہ "سرائیکی ادب" اور بہاول پور سے سہ ماہی "سرائیکی" کی متواتر اشاعت نے سرائیکی افسانے کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ سرائیکی کے اہل قلم حضرات کے ساتھ ساتھ خواتین قلم کاروں نے بھی معاشرے کے مسائل کو تخلیقی قوت سے اجاگر کیا۔ ان جرائد میں شامل ابتدائی دور کے نمایاں افسانہ نگاروں میں حامد تمیم، احسن واگھا، سجاد حیدر پرویز، محمد رمضان طالب، انیس دین پوری، اسلم قریشی، مہر کاچیلوی، ابن الامام شفتر، سعید خاور، انجم لاشاری، مظہر مسعود، صادق جنید ہوت، بشیر بلوچ، حیات قریشی اور ماہنامہ "سرائیکی ادب" ملتان کے مدیر عمر علی خان بلوچ کے ساتھ ساتھ خواتین افسانہ نگاروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ (۴۸)

خواتین افسانہ نگاروں کی کھیپ تیار ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دسمبر ۱۹۷۶ء میں مسرت کلانچوی (پ ۱۹۵۹ء) کی کتاب "اُچی دھرتی جھکا آسمان" اولین سرائیکی افسانوی مجموعے کے طور پر سامنے آئی۔ قبل ازیں اگست ۱۹۷۶ء میں قاسم جلال کی کتاب "تتیاں دے ہیرے" بھی شائع ہوئی جس میں ایک افسانے کے ساتھ ساتھ ڈرامے، نظم اور مضامین شامل ہیں تو گویا اسے باقاعدہ افسانوی مجموعہ نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اس کا عنوان "تتیاں تے ہیرے" بھی ڈرامے کی نمائندگی کرتا ہے۔ بہر حال دو کتابوں سے افسانوں کی اشاعت کی ابتداء ہونے کے باعث ۱۹۷۶ء نے سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لی اور اس کے بعد افسانوی مجموعوں کے شائع ہونے کا سلسلہ چل نکلا۔

مسرت کلانچوی کے اولین افسانوی مجموعے میں جھنگوی شعاع، احساس دا سوجھلا، جیون ہیں قبرستان کیوں، اوترک، دھی وپی پرائی، اُچی دھرتی جھکا آسمان، کوڑیاں عزتاں کوڑے طور، اور معصوم فرشتہ کے عنوانات سے نو افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کا اہم رخ عورت کی مظلومیت کی عکاسی ہے۔ یہ مظلومیت بھرپور انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح اس کتاب کی مساعی تانیثیت کی ان تحریکوں سے بھی جڑ جاتی ہے۔ جو حقوق نسواں کے حصول کے لیے عالمی سطح پر کی جاتی رہی ہیں۔ ان افسانوں میں سے ایک افسانے "اوترک" کے اقتباس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس میں بے اولاد رہنے والی عورت کے ساتھ روا سلوک کو بنیاد بنایا گیا ہے:

"تمہیں میرا پیار چاہیے تھا پر تجھے میری نفرت ملی۔ میری نفرت، میری بے رخی، ساس اور نند کے طعنے، ان سب باتوں نے تمہیں بیمار کر دیا۔ مگر زہراں! اب

میری آنکھیں کھل گئی ہیں، میرا ضمیر جاگ اٹھا ہے۔ تم سے زیادہ بہتر بیوی کوئی ہی
ہو گی بلکہ تم جیسی بیوی کی قدر نہ کرنا انسانیت کی بے قدری ہے۔ آج کے بعد گھر
میں کوئی بھی تمہیں طعنے دینے کی جرات نہیں کرے گا۔ کوئی تم پر آوازے نہیں
کسے گا اور کوئی بھی تمہیں بے اولاد نہیں کہے گا۔" (۱۲)

۱۹۷۸ء میں عامر فہیم (پ۔۱۹۵۰ء) کا افسانوی مجموعہ "جاگدی اکھ دا خواب" کے عنوان سے شائع ہوا۔ تحریر و تقریر پر پابندی کے اس دور میں علامات کا سہارا لے کر عامر فہیم نے سرائیکی افسانے میں نئی ریت، روایت اور رجحان کو فروغ دیا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں کہیں علامتی طور پر، کہیں اشارے کنایے میں اور کہیں تمثیلی انداز اختیار کرتے ہوئے معاشرتی رویوں میں پردہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ان افسانوں میں شامل بعض علامات بہت کم ابلاغ دیتی ہیں۔ اسی ابہام اور پُراسراریت کے باعث رفتہ رفتہ معنی کھلتے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے عامر فہیم کو سرائیکی کا Trend Maker افسانہ نگار قرار دیا۔ جس نے سرائیکی افسانے میں علامتی اظہار اختیار کر کے افسانے کو نئی راہ پر ڈال دیا اور موضوع و اسلوب کے تجربات کے باعث نیا راستہ بنایا بھی ہے اور دکھایا بھی ہے(۱۳)۔ عامر فہیم کے افسانوں میں بشارت، اسم اعظم، سوجھلا تنگی، اکھ دے نیلا کرو، پنجواں زاویہ اور منہ دی اٹکار خاص طور پر مشہور ہیں۔ افسانہ "اسم اعظم" کو مہر گل محمد نے اردو روپ دیا جس کی اختتامی سطور نمونے کے طور پر دی جاتی ہیں:

"ہمیں اسم اعظم بتا۔۔۔۔۔ انھوں نے چیخ کر پوچھا
میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔ اس نے بھی چلا کر جواب دیا۔
کچھ دانت۔۔۔ کچھ ناخن۔۔۔ آگے بڑھے۔۔۔ اس کے بدن کو ادھیڑنے
لگے۔۔۔ خون بہنے لگا۔۔۔۔ کپڑے خون سے رنگین ہونے لگے۔۔۔۔ اپنا خو
ن دیکھ اس کی آنکھوں میں بھی لہو اتر آیا۔۔۔۔ وحب۔۔۔ اس نے ایک کی
ناک پر مکا جڑ دیا۔۔۔۔ وہ الٹ کر پیچھے جا پڑا۔۔۔۔ گیلی مٹی کی خوشبو اس کے
نتھنوں میں پہنچنے لگی۔۔۔۔ درختوں کے سرسبز پتے ہلنے لگے۔۔۔ ہوا میں پھو
لوں کی خوشبو رچنے لگی۔۔۔ جادو ٹوٹ گیا تھا۔۔۔ وہ سب دودھ کی طرح سفید
کپڑے پہنے۔۔۔ اس کے سامنے سجدے میں پڑے تھے۔۔۔۔۔" (۳۱)

۱۹۷۹ء میں اسلم قریشی کے افسانے "سانولی دھپ" کے عنوان سے کتابی شکل میں سامنے

آئے۔ منظر نگاری اور موزوں الفاظ کا انتخاب ان افسانوں کی خاص خوبی ہے۔ اسلم قریشی کی یہ تحریریں سماجی اور عوامی زندگی کی عکاس ہیں جن میں دیہات کے مسائل، شہروں کی مشکلات اور دیگر عوامی الجھنوں کی اصلی اور حقیقی تصویریں پیش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ بعض ایسے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جو ضبطِ تحریر میں آنے کے باوجود گرفت میں نہ آ سکے لیکن ثقیل ترین الفاظ سے گریز برتا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر افسانے شائع ہونے سے قبل ریڈیو پاکستان، بہاول پور سے نشر ہو چکے تھے، ریڈیو سے نشر ہونے کے بعد کچھ افسانوں میں ترامیم بھی کی گئیں۔ یہاں تک کہ کئی افسانوں کے عنوان بھی بدل دیے گئے۔

سجاد حیدر پرویز (پ۔۱۹۶۳ء) کے افسانوں پر مشتمل کتاب "سوجھلا اندھاری رات دا" ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں شامل سرائیکی تراجم کے علاوہ تخلیقی افسانوں میں سوجھلا اندھاری رات دا، کنڈیاں دا مچھ کار، پھلاں دی مہکار، نکا نکر لکھیاں اکھیں، جھمری روپی اور ہک تے چار پنج جیسے عنوانات ہی مختلف علامات کے غماز ہیں۔ سجاد حیدر پرویز کے ان افسانوں میں دھرتی سے لی گئی علامتیں اور استعارے اس انداز سے مستعمل ہیں کہ کہنے اور سننے والے کے درمیان رابطے کا فقدان پیدا نہیں ہوتا۔

سرائیکی افسانہ نگاروں میں احسن واگھا (پ۔۱۹۴۹ء) کو ایک علمی مقام حاصل کیا۔ ان کا افسانوی مجموعہ "تھل کرین دریا" معاشرے کی سماجی اقدار کا ترجمان ہے۔ ۱۹۸۰ء میں شائع ہونے والے اس مجموعے میں ایسے موضوعات سامنے آئے ہیں جو اس سے قبل سرائیکی افسانوی مزاج کا حصہ نہیں تھے۔ ان کے افسانوں کے کردار سرائیکی وسیب کے وہ انسان ہیں جن میں بہت سی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی موجود ہیں۔ ترقی پسندانہ خیالات کے باعث علامت کے استعمال کے ساتھ ساتھ انگریزی الفاظ کی شمولیت کو تعلیم یافتہ کرداروں سے نبھانے کی کوشش کی گئی جس میں کافی حد تک کامیاب نظر آئے۔ متذکرہ مجموعے میں شامل افسانے سوا دوا ہیک دالوں، سوریں دی نور، دھیلے لوک، دوقتال، ماس دے نل، وچھلا، ڈار کلے چیرے، سکھ بجھ، پھنڈر، شاہ دا نجھا، ایہا کند حا وادوا ھڑی، تھل کرین دریا، احسن واگھا کو یقیناً اپنے فن میں یگانہ بنا دیتے ہیں۔

ماہنامہ "سرائیکی ادب" ملتان نے جنوری ۱۹۸۲ء میں "تربیت نمبر" اور اکتوبر ۱۹۸۲ء میں "افسانہ نمبر" شائع کر کے افسانے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ "خواتین افسانہ نگاروں میں شیما سیال، مسرت کلانچوی، شاہدہ رحمن، سعیدہ افضل، پروین عزیز، اقبال بانو، رعنا فاروقی اور صبیحہ قریشی جبکہ افسانہ

نگار حضرات میں عمر فہیم، احسن واگھا، محمد اسماعیل احمدانی، انوار احمد، اسلم قریشی، سجاد حیدر پرویز، قاسم جلال، اسلم عزیز درانی اور ظفر لشاری کے نام نمایاں ہیں۔

ظفر لشاری (پ۔۱۹۴۹ء) کے افسانے سرائیکی وسیب کی روزمرہ زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں سامنے آنے والے مجموعے "تتیاں چھاواں" میں ظفر لشاری کے ذاتی تجربات و مشاہدات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ دس افسانوں کے مجموعے میں شامل افسانوں کے کردار زندگی کے عمومی واقعات سے رونما ہوتے ہیں اور وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے ہی موضوع منتخب کرتے ہیں

مہر کاچیلوی (۱۹۳۵ء۔ ۱۹۹۷ء) افسانہ نگاری میں منفرد طرز حیات کو اجاگر کرنے کے باعث انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جاگیرداری نظام کے خلاف برملا احتجاج پایا جاتا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں شائع ہونے والے ان کے افسانوی مجموعے "سندھڑ" میں شامل افسانے اسدھڑ، امیداں دی لوری، نکھیڑ، ازچوڑے اپنا سیں، رانونو، مذہبی کنڈ، کنواری بیوہ، ماتا رگلی، اونچیاں پال، ہیاں اور میڈی انقلابی دنی جیسے عنوانات کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز مہر کاچیلوی کے افسانوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "دریا زنداں کے اس پار سے جو افسانے لکھے ہیں ترقی پسند انقلابی سوچ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں زندگی کے مشاہدے اور تجربے کے ساتھ لہجے کی کاٹ نمایاں ہے"(۱۵)

۱۹۸۰ء کی دہائی میں سامنے آنے والی کتابوں میں سجاد حیدر پرویز کا دوسرا افسانوی مجموعہ "سوچاں دے ویہڑے" ۱۴۔ جون ۱۹۸۵ء کو شائع ہوا۔ جس میں علامت اور رومانویت کے ساتھ ساتھ شگفتہ انداز تحریر شامل ہے۔ اسی عشرے میں ان کی کتاب "میڈے افسانے" بھی سامنے آئی۔ جس میں زیادہ تر افسانے پہلے مجموعے "سوجھلا اندھاری رات دا" اور دوسرے مجموعے "سوچاں دے ویہڑے" میں شامل افسانوں کے انتخاب کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ سجاد حیدر پرویز کی ان کتابوں نے افسانے کے فن کو فروغ بخشا اور سرائیکی ادب کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔

مسرت کلانچوی کی پہلی کتاب کی اشاعت کے ایک عشرے بعد دوسری کتاب "ڈکھن کیتیں دیاں والیاں" منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے ایک درجن افسانوں میں وہ ان کہی کرداروں کی زبان میں کہہ دی گئی جسے کہنے میں مشرق کی بیٹی کو صدیوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کتاب کا عنوان بھی روایت سے

انحراف کا پتا دیتا ہے جسے مسرت کلانچوی کی خود اعتمادی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہی خود اعتمادی ہی ہے جس کے باعث انداز بیاں کی انفرادیت نے اسے مجسم بنا دیا ہے۔ اسی مجسم خوبی کے اثر سے لکھا گیا ہر افسانہ جب بھی پڑھا، نیا محسوس ہوا اور دیگر افسانوں کے مطالعے کے ساتھ ان کی تعبیریں نئی معلوم ہوئیں

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے مسرت کلانچوی کے افسانوں میں پائے جانے والے خواتین کے مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مسرت کلانچوی نے عورتوں کے مسائل خاص طور پر دیہات کی زندگی اور اُسے بسر کرنے والی عورتوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور وہ اپنی کہانیوں میں عورتوں کی دنیا کے درمیانے اور نچلے طبقے کے لوگوں کی معاشی اور معاشرتی زندگی اور ان کے ماحول کی عکاسی کرتی ہیں اور عورتیں جن حالات و واقعات سے گزرتی ہیں یا ان پر جو کچھ بیتتی ہے اور جو سلوک ان سے روا رکھا جاتا ہے یہ سب حقیقت پسندانہ اور سچے انداز میں مسرت کلانچوی کی کہانیوں میں موجود ہے۔'' (۱۶)

۱۹۸۷ء میں سامنے آنے والی کتاب ''بگر دے پھل'' سید نصیر شاہ (۱۹۳۲ء۔۲۰۱۲ء) کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ حنیف چوہدری کے بقول ''سید نصیر شاہ کی کہانیوں میں سماج کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کہانیوں میں وحدتِ تاثر، جدت اور تازگی ہے'' (۱۷)۔

میانوالوی لہجے کے ان افسانوں میں کھاون کھوون، نا حول ولا، بگر دے پھل، ہک پوسٹ کارڈ، شرابی، ریشم گلی، ہک ماء دے دو پتر، چڑیاں قبراں، منحوس، انجن بند کر، بھین بھرا، فیصلہ، معصوم اور جمہوریت دا پہلا شہید شامل ہیں۔ جن میں طبقاتی تفاوت اور معاشرتی ناہمواریوں کی تہوں کو بھرپور انداز سے کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانہ لکھنے کا انداز کلاسیکی ہے لیکن تمام افسانے نتیجہ خیز ہونے کے ساتھ وحدتِ تاثر کے حامل ہیں۔

سرائیکی ادب میں دلشاد کلانچوی (۱۹۱۵ء۔۱۹۹۷ء) کا نام تحقیق و تنقید کے حوالے سے معروف ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادب میں بھی ایک مقام رکھتا ہے۔ ابتدا ہی سے جرائد کے ذریعے افسانے کی دنیا میں قدم رکھا۔ بعد ازاں ۱۹۸۸ء میں ان کی کتاب ''رات دی کندھ'' منظرِ عام پر آئی جس

میں افسانوں کے ساتھ ساتھ دو ڈرامے شامل ہیں۔ روایتی، تاریخی اور رومانوی انداز کے ان افسانوں میں علامت کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ شوکت مغل نے دلشاد کلانچوی کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے علامت نگاری کو یوں واضح کیا ہے:

"دلشاد کلانچوی جس دور میں افسانے لکھ رہے تھے اس وقت اس ملک میں مارشل لا جوبن پر تھا۔ شاعر اور فنکار علامات کا سہارا لے کے اس دور کو چیت کر رہے تھے۔ اور دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ دلشاد نے بھی وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنا افسانہ (رچھ نچرتے بھیڑ) اسی ماحول میں مکمل کیا۔ اس افسانے میں جانوروں کا حوالہ دے کر ان حالات کی عکاسی کی گئی ہے جو آج بھی بڑے ملکوں کی طرف سے چھوٹے ملکوں کے لیے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ اس کہانی میں مصنف نے عالمی تناظر میں اپنی بات کی ہے اس کا کہنا ہے کہ سپر طاقتیں کمزور ممالک کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں اور کمزور ملکوں کو دبایا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے کہانی کی اس تھیم کو سرائیکی میں نیا تجربہ کہا ہے"(۱۸)

حفیظ خان (پ۔۱۹۵۶ء) نے وہ سب کچھ لفظوں میں پرو دیا ہے جو محسوس کیا اور وہی کچھ محسوس کیا جو ان کے چاروں اور موجود تھا۔ ۱۹۹۰ء میں شائع ہونے والے افسانوی مجموعے "ویہڑی رُت دی شام" میں حفیظ خان کے قلم سے ایسی تحریر سامنے آئی جس میں سادگی بھی ہے اور تفکر بھی، سکون بھی ہے اور حرکت بھی، سنجیدگی بھی ہے اور شگفتگی بھی، خلوص بھی ہے اور نشتر بھی، گویا یہ ثابت ہو گیا کہ افسانے لکھنے کے لیے جس طرح کی زبان و بیان درکار ہے وہ ان کے پاس موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا "خواجہ فرید ایوارڈ" اس کتاب کے حصے میں آیا اور یہ سرائیکی افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جسے اس اہم ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

حفیظ خان کی افسانہ نگاری اور افسانوی مجموعے "ویہڑی رُت دی شام" میں شامل افسانہ "حاصل جمع" کے بارے میں جاوید اختر بھٹی کے تاثرات یوں بیان ہوئے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ حفیظ خان اچھے افسانے لکھتے ہیں۔ وہ اس ہنر سے پورے طور پر واقف ہیں کہ اچھے افسانے میں کون کون سے کیا تاثر دیتے ہیں اور رنگوں

کی آمیزش سے کون سا نیا رنگ بنتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ حفیظ خان کے
افسانے عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتے لیکن کبھی عورتیں ظالم ہیں تو کبھی مظلوم،
ایک عورت کے بہت سے روپ ہیں لیکن بہروپ کوئی نہیں ۔۔۔۔"حاصل جمع"
کی شہلا ایک ماڈرن لڑکی ہے اسے غصہ آتا ہے، وہ دعوت میں چائے کی میز کو
الٹ دینے کی جرات رکھتی ہے۔ وہ نڈر اور بے باک ہے وہ کہتی ہے
۔۔۔۔۔ مجھے اس طرح چائے بنانا بالکل پسند نہیں۔۔۔ مگر کس طرح۔۔۔ اس
طرح کہ قہوے میں دودھ ملانے کی بجائے۔۔۔ دودھ میں قہوہ ملایا جائے۔ مگر
میں رزلٹ تو ایک ہی ہوتا ہے کہ چائے بن جاتی ہے۔۔۔ لیکن یہ بھی تو دیکھنا
ہے کہ فتح کس طرح سے ہے۔۔۔ اف۔ مگر کیسے۔۔۔ ایسے کہ دودھ روشنی کی علا
مت ہے اور قہوہ اندھیرے کی۔ اگر روشنی میں اندھیرا ملایا جائے تو شام ہوتی
ہے اور پھر رات بن جاتی ہے۔۔۔ موت کی علامت۔۔۔ اور مجھے رات سے
خوف آتا ہے۔۔۔۔ جبکہ قہوے میں دودھ ملایا جائے تو اندھیرے میں روشنی
گھلتی ہے۔۔۔ اور جب اندھیرے میں روشنی گھلے تو صبح نمودار ہوتی ہے
۔۔۔ صبح جو زندگی ہے۔"(۱۹)

۱۹۹۰ء میں سامنے آنے والی میاں نذیر (پ۔۱۹۵۸ء) کی خوبصورت اور دلکش کتاب "بلر پانی" کے افسانے نئے تناظر میں پیش کیے گئے۔ ان کے افسانے تخیل اور مشاہدے کے امتزاج کا نتیجہ ہیں جن میں سرائیکی وسیب خصوصاً چولستان کے ثقافتی رنگ واضح نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ افسانوں کے عنوانات (چنگھڑ چیچوکڑ، واہلا، جھکڑ، تماہو، انجی روگی، روہی، تناتوں، بلر پانی، کوبجاں دے گل گھاٹے، سوچاں دا سوہپ، بوکھڑ، کناراں، موتی ویاں مازیاں، تر ورے، کول کت جیبی، گوہ تاف وڈی واسی، جھار، بجھڑ کیے وچ) سرائیکی سماج کی اقدار کے ترجمان ہیں۔ سماجی اقدار میں رومان پرور مناظر بھی وفا شعاری کے ساتھ نمایاں ہیں۔ میاں نذیر کے ان افسانوں میں ٹھیٹھ زبان کا استعمال سرائیکی کے محاورات اور تماثیل و الفاظ کو محفوظ کرنے کی شعوری کوشش ہے۔ اختصار سے پیش کیے جانے والے ان افسانوں کے منفرد اسلوب نے ادبی دنیا میں خوب سے خوب تر کا سامان پیدا کیا۔

"بلر پانی" کے فلیپ پر دی گئی اصغر ندیم سید کی رائے یقیناً اہمیت رکھتی ہے جس میں وہ رقم

طراز ہیں:

"مجھے ان کے افسانے پڑھ کر خوش گوار حیرت ہوئی ہے کہ انھوں نے ذہنی مزاج اور ثقافتی گیرائی کو اپنے احساس میں اس طرح رچا بسا لیا ہوا ہے کہ ان کے ایک ایک لفظ سے موسم اور زمین کی خوشبو پھوٹ پڑتی ہے۔ جو موسم ہم بھلا چکے ہیں ان کی بازیافت کے لیے میاں نذیر کے افسانے ہمارے اندر کے ٹوٹے رشتے کو جوڑتے ہیں (۲۰)"۔

غلام حسین راہی گبول (پ۔۱۹۵۲ء) کا افسانوی مجموعہ "جگر دے پھٹ" ۱۹۹۰ء میں رحیم یار خان سے چھپ کر آیا جس میں عوامی زبان اور خلوص و محبت سے لبریز بول چال کا نرم لہجہ اپنایا ہوا ہے۔ ماحول کے کرب اور آگہی کے عذاب کے جذبات لفظوں میں ڈھلے تو افسانوں کو روپ اختیار کر لیا۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں میں وٹہ سٹہ، بدھو، اپنیاں سجنیں، پالیس والا، ڈاھی نفتی، پٹواری، رہال، محبت دی شادی، برے کم دا برا انجام، جگر دے پھٹ، آلسی، وفادے ونجاری، ڈاج، چندھ پرے دے، اساں کون آں، جیسے عنوانات اس بات کے غماز ہیں کہ افسانہ نگار نے مصیبت زدہ طبقے کے احوال اور ان کے چھوٹے چھوٹے خوابوں کو اپنی تحریروں میں جگہ دی نیز رومانوی رنگ بھی افسانوں کا حصہ ہیں۔

راہی گبول کا ایک اور افسانوی مجموعہ "ڈکھیں رات" چند سال بعد ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ بیس افسانوں پر مشتمل اس مجموعے میں بھی سماجی مسائل کو سیدھے سادے انداز میں پیش کیا گیا۔ البتہ کہیں کہیں طنز و مزاح کا ہلکا پھلکا رنگ برتنے کی کوشش شامل ہے۔ ہر افسانے میں طوالت سے گریز کرتے ہوئے موضوع سے انصاف برتنے کی کاوش کی گئی۔

اسی کی دہائی میں افسانوی مجموعوں کے علاوہ محمد علی احمدانی کا رومانوی افسانہ "پیار دیاں تنگاں" کتابچے کی شکل میں سامنے آیا نیز رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے افسانوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کہانی در کہانی سفر کرتا ہوا سرائیکی افسانہ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں داخل ہوا۔ اس دہائی میں منظور احمد اعوان (پ۔۱۹۳۶ء) کی تین کتابیں "ان سوہنیں وگ" "مجھے دھک" اور "تساکوں مان وطناں دا" سرائیکی افسانے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ "ان سوہنیں وگ" میں معاشرتی مسائل کو مختصر اور طویل دونوں صورتوں کے افسانوں میں شامل کیا گیا ہے جن میں سادہ اسلوب اور روایتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ "مجھے دھک" میں طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ شگفتہ افسانوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اور "تساکوں

ماں وطناں دا" میں پہلی دونوں کتابوں سے انتخاب کے علاوہ چند نئے افسانے بھی شامل ہیں۔ روزی کے غم میں وطن سے دور ہونے کے باعث لکھاری کے ذاتی تجربات ومشاہدات بھی اس مجموعے کا حصہ ہیں جن میں دھرتی سے محبت اور وسیبی حوالے نمایاں ہیں۔

راہی گبول اور منظور اعوان کے ساتھ ناصر فریدی (۱۹۵۷ء۔۲۰۱۰ء) ایسی مثلث کی تشکیل کرتا ہے جس نے رحیم یار خان کے مضافات میں سرائیکی اور سندھی زبان کے جھوم پر منہ بولی کا قرض اتارنے کی ٹھانی۔ اس مثلث کے ان لکھاریوں نے اپنی مدد آپ کے تحت متعدد کتب وسیب کو دان کیں۔ ناصر فریدی کا افسانوی مجموعہ "آدم جایا" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ۱۹۹۳ء میں سامنے آنے والی اس کتاب میں شامل دس افسانے معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کی وکالت کرتے ہیں۔ افسانے "ہڈ پاک" اور "جاگر" سادہ لوح دیہاتیوں کو لوٹنے والے جعلی پیروں کی عیاریوں اور مکاریوں کا پول کھولتے ہیں۔ جس کے باعث حقیقی مرشد اور جعلی پیر کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے۔ "آدم جایا" "چھیڑ" اور "بھری کھاری" ایسے افسانے ہیں جن میں طبقاتی تقسیم اور معاشرتی ناانصافیوں کے باعث روا رکھے جانے والے ظلم وستم اور بے حسی وخود غرضی کو موضوع بنا کر مظلوموں کی دادرسی کی جانب قدم اٹھایا گیا ہے۔ "کالو ہیں ناں بدنام" اور "کہیں سولوں" جیسے افسانے پولیس کے رویوں کے حوالے سے قوم کے محافظوں میں شامل لٹیروں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ افسانہ "سینگلی" ایسے غریب باپ کی کہانی پر مشتمل ہے جس کا بچہ اسے بار بار یاد دلاتا ہے کہ اس کے لیے سینگلی (بے بی سائیکل) خرید کر لائیں اور بچیاں تو نئے جوتوں اور کپڑوں کے لیے بھی ترس گئی ہیں۔ تو گویا کامن ایسا کردار ہے جو اپنے بچوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشات بھی پوری نہیں کرسکتا۔ "گھر جوائترا" ایک ایسا افسانہ ہے جو وسیب میں پائی جانے والی رسومات کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس میں داماد کو سسرال کے گھر میں مستقل رہائش رکھنے کے عمل کو طوق غلامی سے عبارت کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل افسانہ "ساوا پانی" سیاسی اور سماجی پس منظر کے باعث منفرد نوعیت کا حامل ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے وسیب سے ہونے والی ناانصافیوں اور استحصالی رویوں کو نمایاں کیا ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں میں بتول رحمانی (۱۹۵۵ء۔۲۰۰۲ء) کا نام نمایاں ہے۔ ۱۹۹۳ء میں شائع ہونے والے مجموعے "سانجھ" میں دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ عورت کی زندگی کی تہوں کو کھولنے کی ادبی کوشش کی گئی کہ روایتوں کے حصار میں مقید کردار بولنے لگے۔ افسانہ "ماریا عورت" میں

ممتا کی محبت نے عورت کو مات دے دی اور عورت نے ماں کے قدموں میں سر رکھ کر خود کو امر کر دیا۔ اسی طرح ماں کی محبت میں لکھے گئے افسانے وراثت میں ماں کی موت پر وارث نے پورے قبرستان کی بہتری کا انتظام کر دیا۔ "سچا کفن" ایسی بڑھیا کی کہانی ہے جو مرنے سے پہلے اپنے کفن کو سنبھال کر رکھنے کے جتن کرتی رہتی ہے۔ "ماسی مُراداں" کے عنوان سے پیش کیے گئے افسانے میں ایک بیوہ کی داستاں رقم کی گئی ہے جو لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنے بیٹے کی کفالت ایسے کرتی ہے کہ خود تو اُترن پہن کر گزر اوقات کر لیتی ہے لیکن بچے کی انا کو مجروح نہیں ہونے دیتی۔ "بھلیکے" میں عورت کی وفاداری کو ظاہر کیا گیا ہے جو خاوند کے ناروا سلوک کے باوجود بھی ایثار کے جذبے سے سرشار ہے۔ اسی طرح افسانہ "سوایہ نشان" میں ایسی باشعور عورت کے بیاہ کو سامنے لایا گیا جسے بچپن کی منگنی اور بے جوڑ شادی جیسے رسم و رواج کی بھینٹ چڑھا کر ایک بے شعور مرد کے پلے باندھ دیا گیا۔ "کوکنگ بیوٹی" ایسا افسانہ ہے جس میں ایک عورت کی خوبصورتی کو شوہر کی نظر میں منفرد زاویے سے دیکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں جلتی ہوئی آگ کے باعث چہرے پر آنے والی سرخی بیوی کو پُرکشش بنانے کا سبب بنتی ہے ۔ افسانہ "چینڈو" معاشرے میں خال خال پائی جانے والی، اور بدیر آزاد عزم جوانیوں کا المیہ ہے اور افسانہ "مستقبل" کلاس روم کی ایسی کہانی پیش کی ہے جس میں مردانہ کردار شامل ہی نہیں۔ تو گویا بتول رحمانی نے افسانے کو وہ آئینہ بنا دیا جس میں صنفِ نازک کی زندگی کے متعدد پرت منعکس ہو کر سامنے آتے ہے۔

سرائیکی معاشرے میں پائے جانے والے توہمات، ضعیف الاعتقادی، سادہ لوحی، کم علمی اور مجبوریوں جیسے موضوعات پر مبنی (ایک درجن) افسانوں پر مشتمل انیل چوہان (پ۔ ۱۹۷۵ء) کی کتاب "اَک دے اَسب" ۱۹۹۴ء میں منظرِ عام پر آئی۔ "انیل چوہان کی مادری زبان سرائیکی نہیں پھر بھی اسے اپنے علاقے بھکر کی زبان پر عبور حاصل ہے" (۲۱)۔

۱۹۹۵ء میں سامنے آنے والی سرائیکی زبان کے تھلوچی لہجے کی کتاب "بھنبیری" ڈاکٹر محسن مگھیانہ (پ۔ ۱۹۵۹ء) کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اپنی کتاب میں انھیں "لاہندی زبان" کی تخلیقات کیا ہے۔ ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز نے افسانہ نگار کی رائے کو اردو ترجمے کے ساتھ پیش کر کے اسے سرائیکی زبان قرار دیا ہے جو قرینِ از قیاس محسوس ہوتا ہے۔ مصنف کی رائے اس طرح بیان کی گئی ہے:

"جس طرح ہیر کی زبان تو بہت سے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ صرف جھنگ
میں تو نہیں۔ خاص طور پر دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ بھکر، رحیم یار خان،

> بہاول پور، بہاول نگر سے شروع ہو کر اوپر چلے جائیں تو مظفر گڑھ، ملتان، خانیوال، کبیر والا، لیہ، بھکر، میانوالی، ڈیرہ غازی خان بلکہ ڈیرہ اسماعیل خان اور راجن پور تک آپ کو اس لہندے کی زبان بولنے والے مل جائیں گے۔ ملتان، بہاول پور، میانوالی میں سرائیکی رنگ آجاتا ہے۔ مگر خالص سرائیکی زیادہ تر ملتان میں ہے"(۶۰)

''بھیری'' میں موجود دس افسانے زندگی کے چھوٹے بڑے واقعات کو منظر عام پر لاتے ہیں اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''قتل'' پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر انسان کسی نہ کسی موقع پر بے وقوف بنایا جاسکتا ہے۔ ''سفر یا چولا'' میں عورت کی بے وفائی کا حوالہ ملتا ہے۔ افسانہ ''ست ہویڑا'' میں چوپال اور حقے کا چولی دامن کا ساتھ نظر آتا ہے۔ ''کانگ'' میں پیٹھ پیچھے دوست کو بھلا سوچنے کا خوبصورت انداز پایا جاتا ہے۔ ''مکھوال بھول'' ''ڈسکارے'' ''بھیری'' اور ''دروہی خدادی'' جیسے افسانوں میں سرائیکی وسیب کے کئی رنگ اور کئی انگ نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر محسن مگھیانہ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''اشندرے'' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے دس افسانے تہذیبی اقدار کی مختلف جہتوں کے دروا کرتے نظر آتے ہیں۔ افسانہ ''اپنی سنجان'' میں عدالتی مسائل''، ''شک دی چواتی'' میں مرد کے شکوک وشبہات، ''مائی جتری آئی'' میں دانے بھونے کا حوالہ، ''جتھ'' میں زیادہ روکریسی، ''رچی گل'' میں انصاف کی تلاش، ''کوڑا ایمام'' میں مجرے کا تذکرہ، ''بھجائی'' میں بیٹیوں کے مسائل، ''بہارو'' میں تعلیم یافتہ اور ان پڑھ کا فرق، ''جولکاں'' میں وڈیرہ شاہی اور ''اشندرے'' میں رات بھر جاگتے رہنے کے سلسلے کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانہ نگار نے اس کتاب کے افسانوں کی زبان کو بھی ''ا ہندی'' کا نام دیا ہے۔

ڈاکٹر اسلم عزیز درانی (پ۔۱۹۳۹ء) نے ''سجھ دا سنیہا'' کی شکل میں تاریکیوں کے ختم ہونے کی نوید دیتے ہوئے پیام صبح دیا ہے۔ اسلم عزیز درانی کے بیشتر افسانوں کی ابتدا منظر نگاری سے ہوتی ہے اور دھیرے دھیرے موضوعات کو گرفت میں لے لیتے ہیں۔ افسانہ ''سجھ دا سنیہا'' سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں دیس پر قربان ہونے والے کی کہانی میں فرض اور محبت کے مقابلے میں فرض جیت جاتا ہے۔ ''اکرش'' میں پولیس کے روایتی رویے کے ساتھ ساتھ مثبت کردار بھی پیش کیا گیا۔ ''رت اُرماناں دی'' ایسا افسانہ ہے جس میں بے روزگاری کی تلخیوں کا سامنا کرتے ہوئے رشوت، سفارش اور

CamScanner

دیگر معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف کی گئی فکر واضح نظر آتی ہے۔ افسانے "تمنا" اور "دریا، بال تے چیک" "میں ممتا کے روپ اور معاشرتی رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ "ڈاج دا کھاں دا" ،غلط فہمی، ہم پیشہ، ڈکھ پاتل دے، اتحکی تے کوی ب اور تنہائی کے عنوانات سے پیش کیے گئے۔ افسانوں میں تہذیبی پسماندگی، سادگی فطرت اور دیہاتی ماحول کی تبدیلی کے لیے شعور کی بیداری پر زور دیا گیا۔

نوے کی دہائی میں اکادمی ادبیات پاکستان سے "خواجہ فرید ایوارڈ" حاصل کرنے والا افسانوی مجموعہ "پیت پریت" بشریٰ قریشی (پ۔۱۹۶۲ء) کے قلم کا شاہکار ہے۔ ۱۹۹۷ء میں ڈیرہ غازی خان سے شائع ہونے والی اس کتاب میں پائے جانے والے افسانوں میں محبت، محبوب، شرم وحیا، رسم ورواج، سماجی اقدار اور خاص طور پر خواتین کے مسائل واضح طور پر سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ اکثر افسانوں کا انجام طربیہ ہے اور المیہ انجام کے افسانوں کا اختتام بھی اس انداز سے کیا گیا ہے کہ اس میں رنجیدگی کے بجائے امید کی کرن نظر آتی ہے۔ بشریٰ قریشی کی افسانہ نگاری کے حوالے سے جاوید احسن رقم طراز ہیں:

> سرائیکی افسانے کی تاریخ مسرت کلانچوی سے بشریٰ قریشی تک شاندار اور آبدار ہے۔ سرائیکی وسیب سندھ ساگر، روہی، تھل، دامان اور بجی پار کی دھرتی ہے۔ بشریٰ قریشی اس سندھ دھرتی کی بیٹی، مرصع نگار شاعرہ اور خوبصورت افسانہ نگار ہے جس کے فن کا لینڈ سکیپ اپنا من اور وسیب ہے۔ بشریٰ کا ہر افسانہ سماج اور زندگی کے ایک نئے گوشے کی نقاب کشائی کرتا ہے اور اپنے قاری کو دعوت فکر دینے کے ساتھ شریک احساس بنا لیتا ہے اور یہی بات بشریٰ قریشی کے روشن ادبی مستقبل کی ضمانت ہے۔" (۴۳)

حبیب فائق (۱۹۳۳ء۔۲۰۰۱ء) کا افسانہ پختہ لسانی شعور کا آئینہ دار ہے۔ ۱۹۹۸ء میں سامنے آنے والے ان کے افسانوی مجموعے "چیڑ میاں گنڈھیں" میں ماحول، سماج اور معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کا شمار سماج کے مصلح قلم کاروں میں کیا جا سکتا ہے۔ عموماً ان کے افسانے مختصر ہوتے ہیں۔ علامات کے استعمال اور سرائیکی کے منتخب الفاظ کی خوبصورت پیشکش نے کتاب کے معیار کو خوب سے خوب تر بنا دیا ہے۔

سرائیکی ادبی دنیا میں محمد سعید احمد شیخ (پ۔۱۹۶۲ء) کا نام ابھی نیا نیا سامنے آیا تھا کہ

۱۹۹۸ء میں افسانوی مجموعہ "پارت" کے عنوان سے چھپ کر آ گیا۔ اس کتاب میں سرائیکی زبان و ثقافت کا وہ مٹھاس شامل تھا جس پر کسی مٹھے ہوئے قلم کار کا گماں ہونے لگا۔ ان افسانوں میں پائے جانے والے کردار مٹھن، بچل، خیرن، کریمن، احمد، دادو، جتاں، شاں وغیرہ سرائیکی وسیب کے زندہ کردار محسوس ہوتے ہیں۔

۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر غزال احمدانی (پ۔۱۹۲۳ء) کا افسانوی مجموعہ "اج دی مارودی" کے عنوان سے سامنے آیا۔ ڈاکٹر غزال احمدانی نے بنت احمدانی کے قلمی نام سے افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا اور ان کے افسانے رسائل کی زینت بنتے رہے۔ "اج دی مارودی" میں شامل افسانوں کی فہرست میں ہر عنوان کے سامنے سال تحریر بھی درج کیا گیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ متذکرہ ایک درجن افسانے بارہ برس ۱۹۷۹ء تا ۱۹۹۰ء کے دوران میں لکھے گئے۔ کتاب میں دی گئی ترتیب کے بجائے تخلیقی ترتیب سے دیکھا جائے تو ارتقائی عمل کا پتا چلتا ہے۔

غزال احمدانی کے ارتقائی سفر سے پتا چلتا ہے کہ خواتین کے مسائل سے افسانوں کی ابتداء کرتے ہوئے، ایک معاشرے کے ایک جزو کو سامنے رکھا لیکن یہ سفر تمام ہوا تو متعدد معاشرے اس میں سموئے جا چکے تھے۔ مزاحمت، ملامت اور علامت کو شامل کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ اپنی ثقافت اور اپنے وسیب سے لگاؤ ان کی منظر نگاری سے واضح ہوتا ہے۔ روہی تھل دمان کے علاوہ سندھ کی ثقافت کا عکس بھی ان کے مشاہدوں کا نچوڑ ہے۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں متعدد افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ افسانوں کا کڑا انتخاب سامنے آیا۔ اخبارات و رسائل نے افسانہ نگاروں کی ڈھیروں تخلیقات زیورِ طباعت سے آراستہ کیں۔ علاوہ ازیں راہی گبول کے دو افسانے "پالیس دا گھوا" اور "نشانی" الگ الگ کتابچوں کی شکل میں پیش کیے گئے اور شاہد شاہ وشاہد کے شعری مجموعہ "غم دی شام" کے آخر میں افسانہ شامل کرنے کی نئی روایت ڈالی گئی نیز ابن کلیم کی کتاب "ملغوبہ ٹ" میں شامل جزوی افسانے "گوریزی" اور "پنڈ سے پیانے" بھی سامنے آئے۔

سرائیکی افسانہ نئی صدی میں داخل ہوا تو سرائیکی ادب میں منفرد شناخت قائم کر چکا تھا۔ غلام حسن حیدرانی سے لے کر ڈاکٹر غزال احمدانی تک کئی اہم نام اس منظر نامے کا حصہ بن چکے تھے۔ جن کے افسانوی مجموعے قارئین کے سامنے تھے۔ لیکن ابتدائی افسانہ نگاروں میں شامل تحسین سبائے والوی کی

وفات کو دس برس سے زیادہ عرصہ بیت جانے کے باوجود بھی ان کا افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔ ایسے میں غلام جیلانی چاچڑ کی مرتب کردہ تحسین سبائے والوی کی کتاب "اوجھی کندھی" کو سرائیکی ادبی بورڈ ملتان نے شائع کر دیا۔ ۲۰۰۱ء میں شائع ہونے والی اس کتاب میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تحریر "سرائیکی دے پہلے افسانے دا قضیہ" کے علاوہ دس افسانے شامل ہیں۔ سہارا، شہید، قیدی، رقیب، کھلریکا، اوجھی کندھی، روزی رازق ڈیندے، وعدہ، ہک ہیرا ایک پتھر، او کون ہئی؟ کے عنوانات سے سامنے آنے والے ان افسانوں میں معاشرتی مسائل کو عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

سرائیکی ادب میں سیرت نگاری کے حوالے سے غیر معمولی پہچان کرانے والے ملتان کے لکھاری صدیق شاکر (پ۔۱۹۴۱ء) نے افسانوی مجموعہ "بجھوں بٹ بٹ" پیش کر کے سرائیکی قلم کاروں کو حیران کر دیا۔ کتاب کا عنوان سرائیکی وسیب کے باسیوں کی دکھ بھری داستان کے استعارے کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس کتاب میں شامل گیارہ افسانوں میں معاشرے کے محروموں، مجبوروں اور ناداروں کے دکھ اس انداز سے رقم کیے گئے کہ ان کے کردار ہمیں اپنے ارد گرد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

ملک اقبال حسن بھپلا (۱۹۴۳ء۔۲۰۰۹ء) کی کتاب "بالڑ" کے عنوان سے سامنے آئی پہلے حصے میں جس کے دو حصے ہیں۔ ایک ایسی صنف متعارف کرانے کی کوشش کی گئی جو افسانے اور انشائیے کا امتزاج ہے مصنف نے اس صنف کو "بالڑ" کا نام دیا۔ کتاب کے دوسرے حصے میں افسانے شامل کیے گئے ہیں جن میں اختصار پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور دیہات کے مناظر پیش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔

بیسویں صدی کی تین دہائیوں میں ہماری سماجی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ نئی صدی کا افسانہ نگار ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ افسانے کے مزاج میں اس ناگزیر تبدیلی کو عبدالباسط بھٹی (پ۔۱۹۵۸ء) کی کتاب "وکاؤ چھاتورا" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانہ "وکاؤ چھاتورا" سے ایک ایسا اقتباس دیا جاتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ نوجوان سماجی تبدیلیوں کو قبول کر رہے ہیں اور روایت سے رشتہ قائم رکھنے والے بزرگ اس تبدیلی دے نالاں ہیں:

"میں عرض کیتے جو میں ہک رہیا یاں تہوں تاں روٹی میڈی سنڈ دے سنڈ دھراج وسدی اے پر وقت دے نال ٹیکوں روٹی کوں نکھیڑ سٹے، نوکری سکوں ہے گھر چا کیتے، اتوں دنیا دے کپارے ایں ویڑھے کن جو روٹی ونج اوکھا تھی گئے۔ ہک

تاں نوکری دا رولا ڈوجھا بالاں دی پڑھائی۔ دل چا آکھا ڈوں شہر رہا بیٹھاں۔ ایہ جا
ندے دی جو جڈاں مریم دے بیان پیو دا اے آ کے گلستان دے گھر گئی پیر اچ، میں
اماں ایکوں وی ڈاڈھا آہداں جو میڈے نال شہر آ رہو، میں جڈاں وی ایہے
سکیں کوں ایہو گالھ کیتی اے آکھاں خشک لکار بھر ولدی ڈتی ہے۔ دو وے پتر ا توں
چاہندیں جو اساں بچہ دے تی پیو دا دیاں قبراں کنوں نکھڑ ونجوں" ۔ (۲۵)

عبدالباسط بھٹی کے افسانے بالعموم سرائیکی وسیب اور بالخصوص روہی کے علاقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عبدالباسط بھٹی کے ہاں ذخیرہ الفاظ کی فراوانی ہے اور خالص زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ منظر نگاری خوب کی گئی ہے اور متعدد افسانوں کی ابتدا منظر نگاری سے ہوتی ہے۔ جذبات نگاری اور جزئیات نگاری میں کمال حاصل ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد ایاز کے افسانوں کی کتاب "پیر فرید دا اس اے" میں بھی روہی کے ساتھ محبت کو نبھانے کی کوشش کی گئی۔ ان افسانوں میں بشکو، بھکی داس، پپ، دا وارث، بھوتن، اور رام چند منگھیوال جیسے عنوانات روہی میں چلتے پھرتے زندہ جاوید کرداروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

فیض بلوچ (پ۔۱۹۴۴ء) بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن سرائیکی افسانہ لکھنے میں بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کے رنگ واضح نظر آتے ہیں۔ جاگیرداری نظام کے خلاف نفرت اور اصلاح معاشرہ ان کے بنیادی مقاصد کا حصہ ہیں۔ زبان سادہ، خالص اور رواں ہے۔ کردار، واقعات اور مکالمے وسیب ہی سے لیے گئے ہیں۔ فیض بلوچ کے افسانوی مجموعوں "ولدی ڈھلدی چھاں" اور "بھکی داس" میں شامل افسانوں کے عنوانات بھی روایات کے امین نظر آتے ہیں۔

راجہ خان (پ۔۱۹۸۰ء) نے زندگی کی تہوں کو کھولنے کے لیے افسانے کا سہارا لیا اور "ساہوں نال بسیرا" کے عنوان سے افسانوی مجموعہ ۲۰۰۷ء میں پیش کر دیا جس میں فرد خصوصاً عورت کو سماج اور سماجی مسائل سے کبھی جدا نہیں کیا۔ رشتوں میں جکڑے ہوئے انسان راجہ خان کے کرداروں کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ایسے کردار جنہوں نے ہمارے دیہاتوں، قصبوں اور شہروں کے باسیوں کی نمائندگی کی ہے۔ آسان زبان میں لکھی جانے والی اس کتاب میں شامل افسانوں کے موضوعات بھی تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔

سرائیکی افسانے کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھنے والے افسانہ نگاروں احسن واگھا

CamScanner

مسرت کلانچوی، حفیظ خان اور اسلم قریشی نے اکیسویں صدی میں بھی افسانے کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کیے رکھا اور ہر افسانہ نگار نے اس پہلو کی عکاسی کی جس سے وہ مکمل طور پر باخبر تھا۔ مقصدیت اور فن دونوں کا احساس موجود ہونے کے باعث ان کی تخلیقات نے نئی شکل اختیار کی اور افسانے میں علمیت کا معیار بڑھتا چلا گیا۔ اس طرح سرائیکی کے اہم افسانہ نگاروں کے یہاں سماجی، اخلاقی اور سیاسی شعور بیدار ہوا۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں علمیت کا اظہار کر کے خواندہ قاری کے لیے غور و فکر کا سامان فراہم کیا۔ احسن واگھا نے سماجی، سیاسی اور مذہبی زندگی کا مشاہدہ بڑی باریکی سے کیا ہے۔ تہذیبی سچائیوں کے عکاس افسانوی مجموعے ”آدی واس“ میں انہوں نے تہذیب کے اسیر لوگوں کا المیہ بیان کرتے ہوئے ایک فنکار کی طرح کام لیا ہے۔ رسوم و توہم، طبقاتی تضادات، جبر و استبداد اور مذہبی معلومات سے جڑے ہوئے یہ افسانے اپنا تانا بانا چھوٹے چھوٹے واقعات کے تسلسل سے ابھارتے ہیں۔

مسرت کلانچوی کی کتاب ”تھل مارو دا چینڑا“ معاشرے میں پائے جانے والے انتشار و اضطراب اور تصورات و کیفیات کی آئینہ دار ہے۔ جس میں عورت کے جذبات و احساسات کا اظہار بڑی مہارت سے کیا گیا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ عورت کی ترقی کے راستوں میں کون سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ تاریک ذہنوں کی منفی سوچ کو کس طرح مثبت انداز فکر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ دیہاتی ماحول کی ان پڑھ عورت اپنے حقوق کے ثمرات و فوائد سے کیونکر محروم چلی آ رہی ہے۔ وہ شہری ماحول کی تعلیم یافتہ خاتون اپنے حقوق کے لیے کس حد تک لڑنا جان چکی ہے۔ مسرت کلانچوی کے افسانوں میں جنسی استحصال اور جنسی بے راہ روی کے خلاف بھی بھرپور آواز اٹھائی گئی ہے۔

حفیظ خان کے افسانے مشاہدے اور تخیل فکر کا کامیاب اظہار ہیں وہ زندگی کے مناظر کو ان کے پس منظر اور متعلقات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ ”اندر لیکھ دا سیک“ ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ افسانے کے فن کو اعتبار و وقار عطا کرنے والی تحریروں میں جو رنگ جھلکتا ہے اس نے ان کے انداز بیاں میں بے ساختہ پن پیدا کر دیا ہے۔ انہوں نے حقیقت کو بے ترتیب مظاہر کے بجائے ان رشتوں میں تلاش کیا جو ایک منظر کو دوسرے منظر سے جوڑتے ہوئے تصویر کشی کرتے ہیں اور خوبصورتی سے مسائل بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ”اندر لیکھ دا سیک“ میں شامل افسانے جو سماں پیدا کرتے ہیں ان سب کے اپنے اسلوب اور انداز ہیں۔

اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں میں اسلم قریشی کی کتاب "گنگرانڈ" کو اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے خواجہ فرید ایوارڈ حاصل کرنے کا منفرد اعزاز حاصل ہے۔ سائل فکر، گہری سوچ، منفرد انداز اور منتخب الفاظ پر مبنی افسانے معاشرتی رجحانات کو ظاہر کرتے ہیں۔

افسانوی مجموعے "گنگرانڈ" میں فن کا حسن موجود ہے چھوٹے چھوٹے جملے، سادہ اسلوب، مربوط پلاٹ اور کردار نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے تو روایتی موضوعات کو نیا رنگ دینے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

۲۰۰۹ء میں دو ایسی کتابیں سامنے آئیں جو دیگر اصناف ادب کے ساتھ ساتھ جزوی طور پر افسانے کی نمائندگی بھی کرتی ہیں۔ ان میں ابن الامام شفتر کی کتاب "ڈسکیاں تے لشکارے" میں متعدد افسانے اور انشائیے شامل ہیں۔ گوکہ کتاب میں شامل اصناف کو الگ الگ نہیں کیا گیا۔ لیکن افسانے کے معیار پر پورا اترنے والی تحریروں میں "تانگھ"، "عاشو"، "تیلیاں اکھیں نکلے والی" اور "ڈسکیاں" کو شمار کیا جا سکتا ہے۔

مشترک اصناف کے حوالے سے دوسری کتاب "سرائیکی نقد و ادب" حفیظ الرحمن خان نے تحریر کی ہے جس میں تخلیقات کے ساتھ ساتھ تنقیدی جائزے بھی شامل ہیں۔ تخلیقات میں متعدد افسانچے کتاب کا حصہ بنائے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک افسانچہ "چھوہر یا چھوہر" اس طرح پیش کیا گیا ہے:

> "ہک کماندے پیو دے گھر دا اختر بن سنور کے رہن شہر کنوں وتی ایچ آیا۔
> ڈیہاں وی سیر کریندیں اوں محسوس کیتا ہک بائی ایجھی زرا اوں گھور گھور کے
> ڈیہدی اے۔ اوں ایچ بہوں خوش تھیا تے پہلے کنوں زیادہ بن ٹھن کے رہن لگا
> ہک ڈینہہ او چوپال ایچ کھڑا بیٹھا ہا۔ کیا ڈیہدے جو شیار ہوئے ہوئے اوندے
> قریب آ کے تھورنال ڈیہدی پئی اوندے ول ایچ لڈو پھٹن لگ گئے۔
> اختر نے سرگوشی دے انداز پچھیا:
> کیا آہدی ایں؟
> اوں جواب ڈتا:
> کجھ نہیں میں اے ڈیکھن آئی آں جو توں چھوہر ایں یا چھوہر" (۴۶)

مبشر بزدار کا افسانوی مجموعہ "ڈھول ہلو چا موڑ مہاراں" کے عنوان سے ۲۰۱۱ء میں سامنے آیا جس میں شامل کچھ افسانے روایت سے جڑے ہوئے ہیں اور کچھ روایت شکن بھی ہیں ان افسانوں میں دامان (کوہ سلیمان کے دامن کا خطہ) کے ماحول کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔

سرائیکی زبان کے شاعر اور نثر نگار فیض بلوچ کی کتاب "پکھی واس" میں شامل افسانے دیہی زندگی کے مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ ۲۰۱۲ء میں پیش کیے گئے اس مجموعے کا سلیس اسلوب افسانے کو اہم بنانے میں کردار ادا کرتا ہے۔

۲۰۱۲ء ہی میں مرتضیٰ زاہد کا اٹھارہ کہانیوں پر مشتمل مجموعہ "ناگ" ملتان سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کی کہانیاں خطے کی تہذیب و ثقافت کی عکاس ہیں۔

عامر بھایا کا افسانوی مجموعہ "تتی ریت" ۲۰۱۳ء میں خان پور ضلع رحیم یار خان سے شائع ہو کر سامنے آیا۔ جس میں شامل افسانے سرائیکی وسیب خصوصاً روہی کے معاشرتی مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ ان افسانوں سے تخلیق کار کے ذاتی مشاہدے اور اس صنف کی فنی خوبیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میانوالی کے قلم کار سید نصیر شاہ کے افسانوی مجموعے "گھر دے پکھل" کی اشاعت دوم کے علاوہ ڈیرہ اسماعیل خان کے لکھاری حبیب موہانا کے افسانوں کا مجموعہ "سیتلاں دے داغ" کو ۲۰۱۴ء ملتان سے شائع کیا گیا۔ حبیب موہانا کے ان افسانوں میں دیہات کی منظر کشی اور خالص زبان کے استعمال کی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

سرائیکی فکشن کے نمائندہ تخلیق کار حفیظ خان کی کتاب "تن من تیس سر یں" ۲۰۱۵ء کی اہم پیش کش ہے۔ سرائیکی خطے کے حوالے سے سامنے آنے والی ان کہانیوں میں وادی سندھ کی عورت کا مقدمہ بھرپور انداز میں پیش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے جسے اس سے پہلے شائع ہونے والے مجموعہ جات کا تسلسل کہا جا سکتا ہے۔

۲۰۱۶ء میں ڈیرہ اسماعیل خان سے حفیظ اللہ گیلانی کے افسانوں کا مجموعہ "ان رادھ" شائع ہوا۔ دامان کے خطے میں کاشتکاری کے حوالے سے سامنے آنے والے مسائل اس مجموعے کا خاصا ہیں۔ اس علاقے کی ضرب الامثال، محاورات اور ٹھیٹھ الفاظ اس قدر برتے گئے کہ کتاب کے آخر میں فرہنگ شامل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسی سال دامان کے علاقے راجن پور سے تعلق رکھنے والے جاوید آصف کے افسانوی مجموعے "لئی باڑ" میں بھی خطے کے سماجی مسائل خصوصاً زراعت کے شعبے سے تعلق

رکھنے والے مزدوروں کی حالت زار کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عبداللطیف بھٹی کی سرائیکی کہانیاں "وتر ساخ" کے عنوان سے ۲۰۱۷ء میں پیش کی گئیں جن میں دو درجن سے زیادہ سماجی کرداروں کو کہانیوں کے روپ میں سامنے لانے کی شعوری کوشش کی گئی۔ علاوہ ازیں عبدالستار نیئر کے افسانوں کے مجموعے "شودے لوک" کو بھی اسی سال شائع کیا گیا، جن میں معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کی زندگی کے متعدد رنگ شامل ہیں۔ جب کہ سرائیکی کی استاد طلعت لُقی کے افسانے "اکھ دی اگھ" بھی ۲۰۱۷ء ہی کی پیش کش کے طور پر سامنے آئے۔ اس مجموعے کو عورت کے مسائل عورت کے قلم سے پیش کرنے کی خصوصی کاوش کہا جا سکتا ہے۔

محمد مظہر نیازی کے سرائیکی افسانوں کا مجموعہ "کتھاں پٹھڑ پہاڑ" ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آیا۔ میانوالی کے نیچے کے علاوہ تھل کی ثقافت کا بھرپور رنگ ان افسانوں میں جھلکتا نظر آتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد مظہر نیازی اردو اور سرائیکی کے معروف شاعر کے علاوہ افسانہ تخلیق کرنے کی مہارت میں بھی منفرد پہچان کا حامل ہے۔

۲۰۱۹ء میں عبدالباسط بھٹی کے افسانوں کا مجموعہ "بندہ بھاوے ہا تے پانی" شائع ہوا جس میں سرائیکی وسیب خصوصاً روہی کی تہذیب و ثقافت کا عکس واضح نظر آتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے اس مجموعے کو "مہر عبدالحق ایوارڈ" کے اعزاز سے نوازا۔

۲۰۲۰ء میں "ابارل" کی اشاعت ہوئی تو اشولال ایک اہم شاعر کے ساتھ ساتھ کہانی کار کے طور پر بھی سامنے آئے۔ بے شک اشولال کی ہر کہانی الگ موضوع کے حوالے سے پیش کی گئی ہے۔ لیکن یہ کہانیاں وادی سندھ کی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہیں جن میں سندھ اور گنگا جمنا کی تہذیب کا تعلق، غدر اور بٹوارہ کے مسائل، ہندو مسلم کے مشترکہ دکھ سکھ اور ترقی پسندی جیسے موضوعات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

۲۰۲۲ء میں مہرین فاطمہ کے افسانوں کا مجموعہ "جھاتی" کے عنوان سے سامنے آیا۔ ایم فل سرائیکی کی اسکالر کے اس مجموعے میں افسانے کے ساتھ ساتھ افسانچے بھی شامل کیے گئے جو کہ سماج کے مختلف رنگوں خصوصاً انسانی مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اکیسویں صدی کے دوسرے برس اشولال اور شاں کے ترتیب دیے کتابی سلسلے "بیڑی" میں قصے، کہانیاں، افسانے اور تراجم شامل کیے گئے۔ غلام حسن حیدرانی، ملا حسن واگھا، مسرت کلانچوی، ظفر لا

شاری، میاں نذیر اور ڈاکٹر غزال احمدانی کے افسانوی مجموعے تو اس سے قبل انھیں متعارف کرا چکے تھے۔ ان کے علاوہ محمد اسماعیل احمدانی، ارشاد تونسوی، ملک عبداللہ عرفان، ڈاکٹر انوار احمد، مزار خان، ارشاد حسین، نجیب حیدر ملغانی اور اشولال کے افسانے اس کتابی سلسلے کی بدولت سرائیکی افسانے کے ارتقائی سفر میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں سامنے آنے والے کتابی سلسلوں میں "سنجان" اسلام آباد، "جیون جوگ" ملتان، "کوکمن سچار" صادق آباد، "سندھ ساگر" کراچی، "سویل" احمد پور شرقیہ اور "سوجھل سویل" لیہ نے بھی دیگر رسائل کے ساتھ مل کر سرائیکی افسانے کے اشاعتی سلسلے کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔ قومی اخبارات میں سے روزنامہ "خبریں" ملتان، کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن میں "سرائیکی ادب" کی اشاعت کے آغاز سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ سرائیکی ادب کی دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ سرائیکی افسانہ کے لکھاریوں نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنی تخلیقات پیش کیں۔

اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کی جانب سے پاکستانی ادب کے انتخاب کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اسی سلسلے میں شائع "پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء۔ ۲۰۰۸ء: انتخاب افسانہ۔ پنجابی/سرائیکی" کے عنوان سے ۲۰۰۹ء میں شائع ہونے والی کتاب جمیل احمد پال نے مرتب کی ہے۔ جس میں پنجابی اور سرائیکی افسانہ نگاروں کی حرفی ترتیب سے افسانے شامل ہیں۔ اس انتخاب میں سرائیکی کے درج ذیل لکھاریوں کی اہم تخلیقات کو جگہ دی گئی ہے:

نمبر شمار	نام افسانہ نگار	عنوان افسانہ
۱۔	احسن واگھا	[illegible]
۲۔	اسلم قریشی	پُھل تارا کرن
۳۔	انوار احمد	ہک نویں دنیا دی تلاش
۴۔	اکمل چوہان	وک دے انب
۵۔	تحسین سبائے والوی	ڈوجھی کندھی
۶۔	ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز	اندر باہر
۷۔	سید نصیر شاہ	ککر دے پھل
۸۔	شمیم عارف	بسم اللہ دا شیر

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۱۲۔ طاہرہ تونسوی، ڈاکٹر، سرائیکی زبان کی افسانہ نگار خواتین، مشمولہ "پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار"، اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۳۹

۱۳۔ طاہرہ تونسوی، ڈاکٹر (مرتب)، سرائیکی دے چوندویں افسانے، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۱۹۹۹ء، ص ۱۸

۱۴۔ اسرار و عارف (مرتب)، سرائیکی کے شاہکار افسانے، لاہور: سارنگ، ۲۰۰۱ء، ص ۳۹

۱۵۔ سجاد حیدر پرویز، ڈاکٹر، مختصر تاریخ زبان و ادب سرائیکی، ص ۱۹۹۔۲۰۰

۱۶۔ طاہرہ تونسوی، ڈاکٹر، خواتین کی سرائیکی تخلیقات میں عورت، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۰۲ء، ص ۵۸

۱۷۔ حنیف چوہدری، افسانہ، مشمولہ "پنجابی زبان و ادب کی مختصر تاریخ"، مرتب: ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ص ۳۰۲

۱۸۔ شوکت مغل، دلشاد کلانچوی: شخصیت اور فن، بہاولپور: کاروی سرائیکی ادب، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۹۔۱۸۰

۱۹۔ جاوید اختر بھٹی، حفیظ خان کی افسانہ نگاری، مشمولہ "حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں"، مرتب: عصمت اللہ شاہ، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۰ء، ص ۳۶۔۳۹

۲۰۔ میاں نذیر ماہر پانی، ملتان: پاکستان سرائیکی رائٹرز گلڈ، ۱۹۹۰ء (پس ورق، مضمون عبدالحکیم سید)

۲۱۔ سجاد حیدر پرویز، سرائیکی ادب: نور دے چندے، مظفر گڑھ: مجلس سرائیکی مصنفین پاکستان، ۱۹۹۱ء، ص ۲۹۷

۲۲۔ سجاد حیدر پرویز، ڈاکٹر، مختصر تاریخ زبان و ادب سرائیکی، ص ۲۰۰۔۲۰۱

۲۳۔ بشریٰ قریشی، وسیب دے پندھ، ڈیرہ غازی خان: سلیمان اکیڈمی، ۱۹۹۷ء (پس ورق)

۲۴۔ طاہرہ تونسوی، ڈاکٹر (ترتیب و انتخاب)، سرائیکی دے چوندویں افسانے، ص ۱۲

۲۵۔ عبدالباسط بھٹی، رُکا چھا، احمد پور شرقیہ: سجل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۲

۲۶۔ حفیظ الرحمٰن خان، سرائیکی نثر و ادب، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۵۲

CamScanner

ڈراما

''ڈراما'' کا لفظ یونانی زبان سے ماخوذ ہے۔ جس کا مطلب ''کچھ کر کے دکھانا'' کا لیا جاتا ہے۔ ڈرامے کی تکمیل افسانے اور ناول کی طرح محض الفاظ سے نہیں ہوتی بلکہ مجسم عمل کی ضرورت پڑتی ہے۔ یعنی ڈراما الفاظ اور عمل کے مجموعے کا نام ہے۔

یونان کے ساتھ ہندوستان، مصر اور چین کو بھی ڈرامے کے فروغ میں اہم کردار کا حامل گردانا جاتا ہے۔ ہندوستان اور یونان کی قدیم روایات کی نوعیت کے باعث ادب کی اس صنف کے باہمی تعلق کی وضاحت سید وقار عظیم نے کچھ یوں کی ہے:

> مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں یونان کو ڈرامے کی تخلیق اور پرورش میں آغوش، مادر اور گہوارہ کی حیثیت حاصل ہے اور اس لیے ان دونوں ملکوں میں اس صنف ادب کے ساتھ جو تصورات وابستہ ہوئے اور جن روایتوں نے جنم لیا انھی کو آنے والی صدیوں میں بھی اس کے فن کے لازمی عناصر سمجھا گیا۔''(۱)

سرائیکی ادب میں ڈرامے کی ابتدا نقالی سے ہوئی۔ ابتدائی ناٹک پیشہ ور لوگ عوام کو محظوظ کرنے کے لیے لوک مذاق کے انداز میں پیش کرتے تھے۔ جن میں کسی نہ کسی کی نقل اتاری جاتی تھی۔ بعد ازاں تھیٹر قائم ہوئے جو میلوں ٹھیلوں میں کئی کئی مہینوں تک سٹیج ڈرامے پیش کر کے داد و تحسین حاصل کرتے تھے۔ مذہبی تہواروں میں پیش کیے جانے والے ناٹک ''رام کہانی''، ''رام لیلی'' اور ''رام لچھمن دا بن باس'' اور ''لنکا دی فتح'' منظوم ڈراموں کی ابتدائی شکل کے طور پر سامنے آئے۔(۲)

ابتدائی منظوم سرائیکی ڈرامے کے بارے میں دلشاد کلانچوی رقم طراز ہیں:

> ''سرائیکی ڈرامے یا ناٹک اکثر ان شخصیتوں نے لکھے ہیں جو شاعر بھی ہوتے تھے اور سٹیج پر کام بھی کرتے تھے۔ اس طرح انھیں خود کو سٹیج کی ضرورتوں کا پتہ ہوتا تھا اور عوام کے مذاق سے براہ راست واقف ہوتے تھے۔ وقت کے تقاضے بھی ان کے سامنے ہوتے تھے۔

نثر کی مقدار ان سے پہلے کے ڈرامہ نگاروں سے زیادہ ہے"۔(۳)

حسرت ملتانی اور دیگر ڈرامانگاروں نے منظوم ڈرامے میں نثری تحریریں شامل کر کے سرائیکی ڈرامے کو ایک نیا رخ دیا جس کے ساتھ ہی منظوم ڈرامے سے منثور ڈرامے کی راہ ہموار ہوئی۔

سرائیکی نثر میں تحریری، ریڈیائی، اور ٹیلی ڈرامے کی اشکال برصغیر کی تقسیم کے بعد متعارف ہو گئیں۔ سرائیکی کے رسائل و جرائد نے نثری ڈراموں کی اشاعت کو فروغ دے کر ڈرامے کے ارتقا میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ جہاں تک ریڈیائی ڈرامے کا تعلق ہے تو ۱۹۷۰ء کے بعد ریڈیو پاکستان ملتان اور ۱۹۷۵ء میں ریڈیو پاکستان بہاول پور سے ڈرامے نشر ہونے لگے۔ اس صنف کو پذیرائی ملنے پر سرائیکی ڈراما نگاری کی جانب رغبت بڑھی اگر یہ کہا جائے کہ سرائیکی ڈرامے کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے ریڈیو نے پہلی سیڑھی بہم پہنچائی تو شاید غلط نہ ہوگا۔ ریڈیو کے علاوہ پی ٹی وی نے ۱۹۹۰ء سے سرائیکی ڈرامے ٹیلی کاسٹ کرنے کا سلسلہ اس وقت شروع کیا جب پاکستان ٹیلی وژن لاہور مرکز سے ہفتہ وار سرائیکی پروگرام "رت رنگیلڑی" کا آغاز ہوا۔ "رت رنگیلڑی" میں چار مختلف سلسلے شروع ہوئے جن میں ادبی گفتگو، موسیقی، سٹیج شو اور ڈراما کی نشریات کو باری باری شامل کیا جاتا۔ یوں دیگر سرائیکی سلسلوں کی طرح "پی ٹی وی لاہور نے اپنی چوبیس گھنٹے کی نشریات کے شیڈول میں سے سرائیکی ڈرامے کو ہر مہینے کے پچیس منٹ عطا کیے"(۱۰)۔ اس کے باوجود وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرائیکی ڈراموں کی اشاعت و نشریات کے باعث متعدد ڈرامانگار سامنے آتے گئے اور ڈراما نگاری کا سلسلہ آگے بڑھتا چلا گیا۔

سرائیکی ڈرامے کی اشاعت کے حوالے سے کتب کے شائع ہونے سے قبل رسائل و جرائد نے تاریخ ساز کردار ادا کیا(۱۱۔الف)۔ رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے ڈراموں کی فہرست میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین لکھاریوں کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ سرائیکی خواتین کی تخلیقات سے یہ امر عیاں ہے کہ اس خطے کی تعلیم یافتہ خواتین اپنے معاشرے کی پسماندگی اور معاشرتی جبر و تشدد کو بدلنے کی خواہش مند نظر آتی ہیں، خواتین کی تعلیم و بہبود کی خواہاں ہیں اور انھیں مظلومیت کے جال سے نکال کر معاشرے کا ایک باوقار فرد اور فعال رکن بنانا چاہتی ہیں۔ علم کی روشنی نے ان تخلیق کار خواتین کو جلا بخشی ہے اور وہ اس روشنی سے جہالت کے اندھیرے کو کم کرنے کی متمنی ہیں۔ بتول رحمانی کے ڈرامے "منگھو دے ساہ" کا اقتباس جہاں اخبارات و رسائل میں شامل ہونے والے ڈراموں کی نمائندگی کرتا ہے وہاں خو

اتین افسانہ نگاروں کی نمائندگی کا حق بھی ادا کرتا ہے:

ریڈیو اور ٹی وی ڈراموں کے حوالے سے ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز نے تحریر کیا ہے :

"یہ طے ہے کہ موجودہ دور تک آتے آتے سرائیکی نثری ڈراما اپنی ساری ادبی صفات کے ساتھ سامنے آ چکا تھا۔ سرائیکی ڈرامے کا جدید دور ریڈیو ملتان کے قیام [آغاز نشریات ۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء] سے شروع ہوتا ہے جب کہ ریڈیو بہاول پور کے قیام [آغاز نشریات ۱۸ اگست ۱۹۷۵ء] کے بعد پا کستان ٹیلی ویژن سنٹر لاہور کے سرائیکی پروگرام رُت رنگیلی [آغاز نشریات ۱۹۹۰ء] سے مزید مستحکم ہوتا ہے۔ پی ٹی وی لاہور سے سرائیکی پروگرام ۲۳ اپریل ۱۹۹۰ء سے شروع کیا گیا۔ ہفتہ وار پروگرام میں مہینہ وار ڈرامے کی آغاز نشریات ۱۱ اپریل ۱۹۹۰ سے ہی مزید مستحکم ہوا ہے۔ پہلا ڈراما اصغر ندیم سید کا "تو پی جو آدھی رات" ۲ مئی ۱۹۹۰ کو ٹیلی کاسٹ ہوا۔ اس وقت تین سرائیکی چینل وسیب "روہی" اور "کوک" اپنی باقاعدہ نشریات میں ڈرامے کو ترویج دے رہے ہیں۔ ریڈیو پر سرائیکی ڈرامے براڈ کاسٹ اور ٹیلی ویژن پر ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوئے تو کئی خوبصورت ادبی ڈرامے بھی لکھے گئے اور پھر ان ڈراموں کی اشاعت کا سلسلہ اخبارا ت و رسائل کے علاوہ کتابی شکل میں بھی شروع ہوا" (۱۳)

کتابی شکل میں شائع ہونے والے ڈرامے کا جہاں تک تعلق ہے تو ۱۹۷۶ء سے جزوی اشا عت کے طور پر ڈرامے کا آغاز ہوا جس کے مطابق ایسی کتابیں شائع ہو کر آئی ہیں جن میں دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ طبع زاد ڈرامے بھی شامل ہیں۔ اس دوران میں سید نذیر علی شاہ کے ڈرامے "الجیال" کا پہلا حصہ کتابچے کی شکل میں شائع ہوا۔ ۱۴۰۰ ہجری (۱۹۸۰ء) میں سامنے آنے والے اس تاریخی ڈرا مے میں سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ دراصل یہ ڈراما دو حصوں پر مشتمل ہے جس میں آٹھویں صدی ہجری سے بارہویں صدی ہجری تک کے واقعات شامل ہیں لیکن صرف پہلا حصہ شائع ہو سکا ہے۔

سرائیکی ڈرامے کے جزوی سلسلے کی پہلی کڑی قاسم جلال کی کتاب "جھوں تے بیرے" ہے جو ۱۹۷۶ء بہاول پور سے چھپ کر آئی جس میں افسانے، ڈرامے، فیچر اور مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کا

عنوان "ہنجوں تے ہیرے" ایک ایسے ڈرامے کی نمائندگی کرتا ہے جسے ۱۹۷۶ء میں تو "ہوں دے شعلے" کے عنوان سے پیش کیا گیا لیکن اس کتاب کی اشاعت دوم (طبع شدہ ۲۰۰۱ء) میں ڈرامے کے لیے بھی یہی عنوان تجویز کیا گیا۔ اس ڈرامے کے علاوہ ایک فیچر بہ عنوان "ڈوھر تاں" بھی قاسم جلال کی کتاب کا حصہ ہے۔ ۱۹۷۵ء میں مہر کاچیلوی کی تخلیقی کتاب "سدھر" شائع ہو کر سامنے آئی جو دراصل ایک افسانو ی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں افسانوں کے ساتھ ساتھ ایک ڈراما "قیدی دا پرناں" بھی شامل کر دیا گیا جو اس سے قبل ماہنامہ 'سرائیکی ادب' ملتان کی اشاعت کا حصہ بھی بن چکا ہے۔ اسی طرح افسانوں اور ڈرا موں پر مبنی مسرت کلانچوی کا مجموعہ "رات دی کندھ" ۱۹۸۸ء میں سامنے آیا جس میں دو ڈرامے "نزس" اور "جنس دی تبدیلی" شامل کیے گئے ہیں۔ راہی گبول کی کتاب "منظور ے تیز" اور منظور احمد اعوان کے افسانو ی مجموعے "کچے دھاگے" میں شامل ایک ایک ڈراما بھی جزوی اشاعت میں شمار ہوتے ہیں۔ جزوی اشا عت سے سامنے آنے والے ان ڈراموں سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ نثری ڈرامے کی جانب راغب ہونے والوں میں ایسے لکھاری شامل ہیں جو سرائیکی افسانوں میں بھی طبع آزمائی کر چکے ہیں ۔ بلکہ یہ بات اس وقت زیادہ واضح ہو کر سامنے آئی ہے جب سرائیکی ڈرامے کے ابتدائی مجموعے پیش کیے گئے ۔ کیوں کہ ۱۹۸۹ء میں سرائیکی ڈرامے کے دو مجموعے سامنے آئے اور دونوں قلم کار سرائیکی افسانے کے میدان میں بھی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں مسرت کلانچوی کی کتاب "تھئے صباحیں" پر تاریخ اشاعت مئی ۱۹۸۹ء اور حفیظ خان کی کتاب "کچ دیاں ونگاں" پر جون ۱۹۸۹ء کا اندراج کیا گیا ہے۔

مسرت کلانچوی کی کتاب "تھئے صباحیں" میں زیادہ تر ریڈیائی ڈرامے ہیں جنھیں اشاعت سے قبل ریڈیو پاکستان بہاول پور سے نشر کیا گیا۔ افسانے کے ساتھ ساتھ ڈرامے میں بھی مسرت کلانچوی کی انفرادیت برقرار ہے۔ بے چھٹے کردار، جذبات نگاری اور جزئیات نگاری میں ذاتی مشاہدے کا عکس زبان و بیان اور مکالمہ نگاروں میں دیہاتی و شہری زندگی کا مختلف انداز اور وسیب کی تاریخ و ثقافت کا بھرپور اظہار مسرت کلانچوی کی فنی و فکری صلاحیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ منو بھائی کے مطابق:

> "مسرت کی انتہائی قابل توجہ اور نمایاں ترین انفرادیت ہے کہ وہ امیر ترین ثقافت اور غریب ترین معیشت کی گود میں پلنے والی نوجوان نسل کے جذباتی مسائل نہایت دلکش سادگی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ یہ وہ کام ہے جو کوئی دوسرا

نہیں کر رہا۔ یہ اتنا مشکل کام ہے کہ ڈرائنگ روموں اور ٹی ہاؤسوں میں بیٹھ کر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے معاشرت کے قیم کدوں میں جھانکنا ہی کافی نہیں۔ ان غریب خانوں میں رہنا بھی پڑتا ہے اور یہ کام مسرت کلانچوی ہی کر سکتی ہے۔"

(۷)

مسرت کلانچوی کی کتاب ''سنجھ صباحیں'' میں ۱۹۸۰ء کے بعد لکھے جانے والے ڈرامے شامل ہیں۔ اس سے قبل رسائل و جرائد کی زینت بننے والے ابتدائی ڈراموں کو اس کتاب کا حصہ نہیں بنایا گیا۔

حفیظ خان کا نام سرائیکی ڈرامے کی پہچان ہے۔ ان کے پانچ مجموعے شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان پانچ مجموعوں میں دو مجموعے ''ماں ں جدل خان'' اور ''خواب گلاب'' بچوں کے ڈراموں پر مبنی ہیں اور دیگر تین مجموعے ''کچ دیاں ماڑیاں''، ''زنجیرے چندے'' اور ''کوئی شہر ہیں جنگل توں کھوا'' ریڈیائی اور ٹیلی ڈراموں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آخری دو کتب اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں شائع ہوئی ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں شائع ہونے والا ''کچ دیاں ماڑیاں'' ان کے ڈراموں کا اولین مجموعہ ہیں جس میں شامل چھ ریڈیائی ڈراموں میں سے پانچ ڈرامے ریڈیو پاکستان ملتان سے نشر ہوئے اور ایک ڈرامہ ریڈیو پاکستان بہاول پور سے نشر کیا گیا۔ ان ڈراموں میں ڈاڈھ کریں یک، بچھا تویں، کچ دیاں ماڑیاں، ریشم دی گلی تند، بھر دی کندھ اور پہلے چتراں دی بہار شامل ہیں جن میں سے ریڈیو پاکستان بہاول پور سے نشر ہونے والا ڈراما ''بچھا تویں'' ہے اور دیگر پانچوں ڈرامے ریڈیو پاکستان ملتان کی نشریات کا حصہ ہے۔ ''کچ دیاں ماڑیاں'' کے حوالے سے امجد اسلام امجد کے تاثرات کچھ یوں ہیں:

> ''اگرچہ اس کے موضوعات بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے اقدار، نظام اور مشینوں کی حکومت سے پیدا ہونے والے آشوب سے لیے گئے ہیں اور اس کا میڈیم یعنی ذریعہ اظہار بھی ریڈیو جیسی ایک جدید سائنسی ایجاد ہے مگر علاقے کی مخصوص خوشبو اور ایک بھرپور لہجے کی مہک نے ان ڈراموں میں ایک انوکھی جاذبیت پیدا کر دی ہے۔

حفیظ خان کے ریڈیائی ڈرامے سرائیکی زبان کے بھرپور اور روشن مستقبل کی طرف

ف کھلنے والا ایسا دروازہ ہے جس کے اس پار امکانات کا ایک جہاں تازہ
انگڑائیں لیتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔"(۸)

پاکستان ٹیلی وژن کے سرائیکی پروگرام "رُت رنگیلڑی" کی نسبت سے قاسم جلال کا ٹیلی ڈراموں کا مجموعہ "رُت رنگیلڑی" ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا۔ پروگرام "رُت رنگیلڑی" میں ٹیلی کاسٹ ہونے والے دو ڈرامے "سانگے" اور "تجوک" اس مجموعے میں شامل ہیں۔ کتاب کے شروع میں پروفیسر سجاد حیدر پرویز کا طویل دیباچہ دیا گیا۔ جس میں ان ڈراموں کے تجزیے کے ساتھ ساتھ سرائیکی ڈرامے کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازیں سرائیکی پروگرام "رُت رنگیلڑی" کے پہلے پروڈیوسر اور سرائیکی کے معروف افسانہ نگار محمد اسلم قریشی کی رائے بھی کتاب کا حصہ ہے۔ اس رائے کے مطابق قاسم جلال ایک جانا پہچانا اور منفرد انداز کا شاعر تو ہے ہی، وہ ایک اچھا نثر نگار بھی ہے۔ وہ نثر میں تخلیق اور تنقید دونوں راستوں کا مسافر بنا اور نام کمایا، چاہے قاسم جلال نے افسانے یا ڈرامے بہت زیادہ تعداد میں نہیں لکھے مگر یہ منتخب تخلیقات اپنے اندر ایک تاثر ضرور رکھتی ہیں۔(۹)

قاسم جلال کی کتاب "رُت رنگیلڑی" کے بارے میں ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کی رائے سے کسی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے:

> "رُت رنگیلڑی کے دونوں ڈراموں میں کچھ قدریں مشترک ہیں جیسے دونوں ڈرامے شادی کے مسئلے پر ہیں۔ دونوں میں یونیورسٹی کا ماحول اور یونیورسٹی گراؤنڈز میں ہیرو ہیروئن کی ملاقاتیں دکھائی گئی ہیں۔ مگر ایک ڈرامہ طربیہ ہے اور دوسرا المیہ۔ ایک سیدھا سادا واقعاتی ڈرامہ ہے تو دوسرا الجھا ہوا نفسیاتی ڈرامہ ہے۔ ایک دیہاتی زندگی کی نمائندگی کرتا ہے تو دوسرا شہری زندگی کی عکاسی۔ اسی تناظر میں ہم ڈرامہ نگار کے مزاج اور فنی تنوع کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔"(۱۰)

رستم طلب کے ڈراموں کا مجموعہ "زمین اسمان" ۱۹۹۹ء میں بہاولپور سے شائع ہوا۔ سات ڈراموں پر مشتمل کتاب میں سرائیکی ثقافت کے متعدد رنگ جھلکتے نظر آتے ہیں۔ دو نسلوں کے درمیان پائے جانے والے تضاد کو خاص طور پر موضوع بنانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ ڈرامے کے کردار فطری اور حقائق کے عکس معلوم ہوتے ہیں۔ زبان و بیان کی سادگی کے ساتھ بعض مقامات پر ثقیل الفاظ کا استعما

CamScanner

ل بھی کیا گیا ہے جس کے باعث اُسلوب کی روایت سے جڑت اور ماں بولی سے محبت کا واضح اظہار ملتا ہے۔ البتہ بعض ڈراموں کے مناظر کی وضاحت اردو میں اور بعض کی سرائیکی میں کی گئی تو اس طرح یہ دورنگی ضرور کھٹکتی ہے۔

مقبول عباس کاشر نے ڈراموں کے تین مجموعے پیش کیے، جن میں سے "چندر تارے" اور "چاچا الف خانی" بچوں کے ڈرامے ہیں۔ تیسرے مجموعے کے ڈرامے "گونگیاں کندھاں دا شور" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو کر سامنے آئے۔ اس کتاب میں پانچ ڈرامے گھر اپنا گھر، ایک رات دا مہمان، گونگیاں کندھاں دا شور، میڈا ماء اور جھوکاں تھیسن آباد ول شامل ہیں۔ یہ پانچوں ڈرامے اس سے پہلے ریڈیو پاکستان ملتان سے نشر ہو چکے ہیں اور ریڈیائی
ڈرامے کے حوالے سے ان کے کردار اپنے اپنے مقام پر سچے محسوس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے مطابق مقبول عباس کاشر ایک باشعور ڈراما نگار ہے جو اپنے وسیب اور اس میں بسنے اور سانس لینے والوں کو ان سے بھی زیادہ جانتا ہے۔ کیوں کہ وہ ان کی ترجمانی ان سے بڑھ کر کرتا ہے اور ان کے جذبات و احساسات کا اظہار سچے اور کھرے انداز میں کر دیتا ہے اس طرح اس کی اور وسیب کی سماجی سوچ سامنے آ جاتی ہے۔ اس نے جو زبان استعمال کی ہے وہ بہت خوب صورت اور ادبی زبان ہے اور اس لب و لہجے کی سرائیکی کو ضرورت بھی ہے۔ (۱۱)

مقبول عباس کاشر کا ہر ڈراما ایک نئے انداز، نئے اسلوب اور نئی فکر کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ان ڈراموں میں پیش کیا جانے والا ہر موضوع اپنی انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت ہے جس نے بیسویں صدی کی آخری دہائی کے سرائیکی ڈرامے کے لیے سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

رضا گیلانی کا مجموعہ "کنوار" ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔ ملتان سے شائع ہونے والی اس کتاب میں چھ ڈرامے پیش کیے گئے ہیں۔ پاکستان ٹیلی وژن سے ٹیلی کاسٹ ہونے والے ان ڈراموں کے موضوعات عام فہم اور عنوانات مختصر الفاظ میں دیے گئے ہیں۔ ان عنوانات میں کنوار، کوڑ سچ، گل دا بار، نصیب، یک منزیں اور سچ شامل ہیں۔

حفیظ خان کی تخلیق "اندھرے چدھ" ریڈیائی اور ٹیلی ڈراموں کا ایسا مجموعہ ہے جسے ۲۰۰۵ء میں ملتان سے شائع کیا گیا۔ اس مجموعے میں شامل سات ڈراموں میں سے پانچ ڈرامے ریڈیو کے لیے اور دو ڈرامے ٹیلی وژن کے لیے لکھے گئے۔ پہلے ڈراموں کی طرح حفیظ خان کے یہ ڈرامے بھی

سرائیکی وسیب کی معاشرت و ثقافت کے آئینہ دار ہیں جن میں "روہی، تھل، دامان" کے مسائل کو منفرد انداز میں سامنے لانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔

"ڈھڑے چندہ" میں شامل دو ٹیلی ڈراموں کے بارے میں مصنف خود لکھتے ہیں:

> "ڈراموں کے اس انتخاب میں میرے دو ٹیلی پلے بھی شامل ہیں، ۔۔ 'اپا چیپ
> مور جھنگلو دی جھمر' ۔۔۔ اپا چیپ ۱۹۸۹ء میں میرے سرائیکی افسانے 'وچھڑی رُ
> ت دی شام' کو بنیاد بنا کر پاکستان ٹیلی وژن لاہور سنٹر کے پروگرام "رُت
> رنگیلڑی" کے لیے لکھا گیا جو ان دنوں شروع کیا جا رہا تھا مطلوب تھا۔ مگر (غالباً)
> مقصود گلیمر نہ ہونے کے سبب اس کی بجائے اپنے پیارے شاہد (اصغر ندیم سید)
> کا سرائیکی ڈرامہ ٹی وی سے دکھایا جانے والا پہلا ڈرامہ کہلایا اور یوں 'اپا چیپ' کی با
> ری چند دنوں کے بعد آئی۔" (۱۴)

حفیظ خان کی کتاب "کوئی شہر ہیں جنگل تو کدا" ۲۰۰۸ء میں شائع ہونے والے ٹیلی ڈراما سیریل کے طور پر سامنے آئی ہے۔ روہی کے خدوخال کو واضح کرنے والا تیرہ اقساط اور ۱۳۲ مناظر پر مشتمل یہ ڈراما سیریل سرائیکی ڈرامے کی تاریخ میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ چولستانی گھر کے ایک منظر سے شروع ہونے والے اس ڈرامے میں دیہات کی عکاسی کے علاوہ شہری زندگی کے حالات حاضرہ کے پردے چاک کرنے کی شعوری کوشش بھی شامل ہے۔ محمد حفیظ خان کے اس ٹیلی ڈراما سیریل میں چولستان سے تعلق رکھنے والے کرداروں میں روہی، نمولی، شیداں، میرو، ساری، اماں، رنگی اور بختاں نمایاں ہیں جب کہ شہری ماحول سے وابستہ کردار سیٹھ رزاق، لیڈی سیکرٹری، ناصر، ہاشم، ویدو، گلفام، ریحانہ اور بلقیس شامل ہیں۔ تخلیق کار نے دیہاتی اور شہری حوالے کے کرداروں کے انداز بیان کو الگ الگ کرنے کی کوشش تو کی ہے لیکن شہری اسلوب دیہی انداز پر حاوی رہا۔ محمد حفیظ خان کی کتاب "ہک رات دا ڈکھ" سرائیکی ٹی وی چینل "وسیب" سے ٹیلی کاسٹ ہونے والی ڈراما سیریل پر مشتمل ہے۔ اکیسویں صدی کے تیسرے عشرے کے آغاز میں سامنے آنے والی یہ کتاب سرائیکی ڈراما نگاری میں اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

خالد اقبال کی تلاش و جستجو سے سامنے آنے والی کتاب "سرائیکی ریڈیائی ڈرامے" ملتان سے شائع ہوئی۔ جس میں ریڈیو پاکستان ملتان سے نشر ہونے والے ڈراموں کا انتخاب شامل ہے۔ ریڈیو پا

کستان ملتان سے پیش ہونے والے ان ڈراموں کی تلاش اور مختلف انداز سے تحریر کیے گئے سکرپٹ کو سرائیکی کے مروجہ رسم الخط میں ڈھالنے کی ذمہ داری لے کر خالد اقبال نے اہم پیش رفت کی ہے اس کتاب کے باعث جہاں معروف ڈراما نگاروں کے ڈرامے پیش کیے گئے وہاں ایسے ایسے ڈرامے بھی سامنے آ چکے ہیں جن کی اشاعت شاید ہی ہو سکتی۔ "سرائیکی ریڈیائی ڈرامے" میں شامل ڈراموں کے عنوانات مع ڈراما نگار ذیل میں دیے جاتے ہیں:

عنوان	ڈراما نگار
اے گورکوں ہی بولیا	رفعت عباس
مٹکل	حسن رضا گردیزی
سی	منور شہزاد
پوڑا	غلام حسن حیدرانی
دریا نوں رات صحرا	نصر اللہ خان ناصر
میکلس	شبیر حسن اختر
گئی تتی کالہ	مسرت کلانچوی
کچ دیاں ماڑیاں	حفیظ خان
ماں ہاتے سکی	خالد اقبال
گورکن	طارق شاہ
سانجھے ڈکھ	عامر فہیم
ہک رات دا قرض	رفیق خاور جسکانی
ڈجے ویہاڑے دی تریہہ	ڈاکٹر انوار احمد

ان ڈراموں میں غلام حسن حیدرانی کا ڈراما "پوڑا" ریڈیائی ڈراما نہ ہونے کے باوجود خصوصی اہمیت کے باعث شامل کیا گیا ہے۔ جب کہ منور شہزاد کا لکھا گیا ڈراما "سی" داماں کے علاقے کی معروف داستان "سسی داراں" کے متعلق ہے اور یہی داستان غلام حسن حیدرانی نے "سی" کے عنوان سے مثنوی کی ہیئت میں پیش کی ہے۔ اس ڈرامے کے بیشتر حصے اسی داستان سے ماخوذ ہیں۔

CS CamScanner

سفرنامہ

سرائیکی زبان میں منظوم سفرنامے کی روایت انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ سفرنامے زیادہ تر حج و عمرہ کے سفر یا زیارات مقدسہ سے متعلق تھے۔ بعد ازاں منظوم سفرنامے میں نثر کو بھی شامل کیا جانے لگا جن میں سے بیشتر قلمی نسخہ جات کی شکل میں یا مطبوعہ کتابچوں کی صورت میں پائے جاتے تھے۔ جہاں تک سرائیکی نثر کے اہم اور مطبوعہ سفرنامے کا تعلق ہے تو یہ سلسلہ ۱۹۸۰ء میں محمد اسماعیل احمدانی کی کتاب "پیت دے پندھ" سے شروع ہوتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان سے اولین "خواجہ فرید ایوارڈ" کا اعزاز حاصل کرنے والا یہ ایک تصوراتی سفرنامہ ہے جو ساکھنڑ (سندھ) سے فورٹ منرو تک کے ایسے سفر کی داستان جس میں سرائیکی وسیب کی تہذیب و تمدن اور زبان و ثقافت کی عکاسی کی گئی ہے۔

سجاد حیدر پرویز کی کتاب "ویندیں ویندیں" میں تین مختلف سفرنامے شامل کیے گئے۔ ان مختصر سفرناموں میں کوہ سلیمان کے "درہ سوڑا" کے سفر کی کہانی قبائلی اور دیہی علاقوں کی تہذیب و ثقافت کی ترجمان ہے۔ دوسرا سفر کراچی کے شہری علاقے کا ہے جب کہ تیسرا سفرنامہ جاپان سے تعلق رکھتا ہے۔

ممتاز حیدر ڈاہر کا سفرنامہ "پکھی واس" بھارت کے سفر کی داستان پر مشتمل ہے جس میں دیگر شہروں کے ساتھ ساتھ "آگرہ" کے سفر کی روداد کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے۔ یہ سفرنامہ ایسے بیانیہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی جس سے پاکستان اور بھارت کی تہذیب و ثقافت کے عناصر کا موازنہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔

محمد اعظم سعیدی کا سفرنامہ "روہی لیر کتیر" چولستان کے مختلف رنگ واضح کرتا ہے۔ اس سفرنامہ میں روہی اور خواجہ غلام فرید کے تعلق کے ساتھ ساتھ اس علاقے کے مسائل کی نشاندہی کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

عبدالباسط بھٹی کا سفرنامہ "کوکدے پندھ گرلاندے پاندھی" روہی کی ثقافت کا ترجمان ہے جس میں احمد پور شرقیہ کے مضافات میں چولستان کے صحرا میں موجود معروف قصبہ "چنن پیر" کے سالا

CamScanner

نہ میلہ کا آنکھوں دیکھا حال شامل ہے۔

شمالی علاقہ جات کے سفر پر مشتمل جہانگیر مخلص کا سفرنامہ ''چند جزیرے'' کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سفرنامہ کو اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے ۱۹۹۷ء کا خواجہ فرید ایوارڈ ملنے کا اعزاز حاصل ہے۔ جہانگیر مخلص نے منظر نگاری اور مکالمہ نگاری کے ذریعے زبان و بیان میں خوب رنگ بھرا ہے۔

روہی، تھل، دامان کے حوالے سے حمید الفت ملغانی (راقم) کا سفرنامہ ''پاندھی پنچھاں واٹیں ٹکاں'' ۱۹۹۸ء میں ملتان سے شائع ہوا۔ اس سفرنامہ کا آغاز خواجہ غلام فرید کی جنم بھومی ''چاچڑاں'' سے ہوتا ہے جب کہ اس کا اختتام خواجہ غلام فرید کے مدفن ''کوٹ مٹھن'' کے مقام پر کیا گیا۔ کتاب کا عنوان اور تمام ابواب کے عنوانات خواجہ غلام فرید کے مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ اس سے بھونگ اور بھونگ سے چنیاں تک کا سفر ''روہی'' کی ترجمانی کرتا ہے۔ پاک پتن سے ملتان تک کا سفر وسیب کے مرکزی حصے کو ظاہر کرتا ہے۔ مظفر گڑھ سے کالا باغ تک تھل اور ڈیرہ اسماعیل خان سے کوٹ مٹھن تک دامان کے سفر کا احاطہ کیا گیا۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں نذیر لغاری کا سفرنامہ ''سیتے جھوکاں دیدیں دیرے'' کے عنوان سے سامنے آیا۔ سعودی عرب، مصر اور لندن کے سفر کی اس کہانی میں ان علاقوں کے سماجی احوال کو شعوری طور پر اپنی دھرتی کے سماج سے جوڑنے کی کوشش واضح طور پر نظر آتی ہے۔

محمد رمضان طالب نے حج کے سفر کی کہانی کو ''سفر سوہنے ڈیں دا'' کے عنوان سے ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ یہ سفرنامہ، حج اور عمرہ کرنے والوں کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے نیز اپنی بات کو موثر بنانے کے لیے سفرنامہ نگار نے اپنی شاعری بھی شامل کی ہے۔

مزار خان نے بھارت کے سفر کی داستان کو ''ککھ دی کہانی'' کا عنوان دیتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں تحریر کیا ہے۔ یہ سفرنامہ دلی میں بیتے دو یوم کے احوال کو بیان کرتا ہے جس میں وہاں کے مختلف امور کا موازنہ اپنے وسیب سے کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔

محبوب تابش کی کتاب ''رول گیا'' سرائیکی ادبی بورڈ ملتان کی پیش کش ہے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں کے بارے میں سامنے آنے والا یہ سفرنامہ مختلف مواقع پر کیے گئے سفر کے احوال کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ ملک کے چاروں صوبوں کی نمائندگی موجود ہے۔ کتاب کو رنگین تصاویر سے بھی

تحریر کیا گیا ہے۔

قاسم سیال کا سفرنامہ "پندھ پندھ عزروے" بھی سرائیکی ادبی بورڈ ملتان کی اشاعت کے طور پر سامنے آیا۔ یہ سفرنامہ تین ممالک ایران، تھائی لینڈ اور سری لنکا کے سفر کی کہانی ہے جس میں ان ممالک کی معاشرت کا تذکرہ دلکش پیرایہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ علاوہ ازیں قاسم سیال کا سفرنامہ "حج میڈا عشق دی توں" بھی سامنے آ چکا ہے۔ اس سفرنامہ میں سفر کا احوال ڈائری کے انداز میں شروع سے آخر تک پیش کیا گیا۔ سفرنامہ کا اسلوب سلیس اور دل میں گھر کرنے والا ہے۔

بھارت کے حوالے سے شوکت مغل کے دو سفرنامے "دلی ڈھائی کوہ" اور "ملتان کنوں پٹیالے تئیں" شائع ہو چکے ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں سامنے آنے والا سفرنامہ "دلی ڈھائی کوہ" میں دہلی، آگرہ، اجمیر اور جے پور کے احوال کو شامل کیا گیا۔ دلی کے سفر میں درگاہ حضرت نظام الدین، لال قلعہ، مقبرہ ہمایوں اور قطب مینار، آگرہ کے حوالے سے تاج محل اور اجمیر شریف کے سفر میں خواجہ معین الدین اجمیری کے تذکرے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں جب کہ ۲۰۱۲ء میں اشاعت کے مرحلے طے کرنے والا سفرنامہ "ملتان کنوں پٹیالے تئیں" پٹیالہ میں ہونے والی ایک عالمی کانفرنس کی روداد کے بارے میں ہے جسے ڈائری کے رنگ میں باقاعدہ تاریخ وار تحریر کیا گیا۔ اس سفرنامہ میں بھارت کے مختلف شہروں اور قصبوں کے تعارف اور تاریخی حیثیت کو بھی شامل کیا گیا۔

دلبر حسین مولائی کے سفرنامہ "تو بدے مسافر" میں سعودی عرب، شام، عراق اور ایران کے مقدس مقامات کے سفر کی کہانی شامل ہے۔ اس کتاب میں ان ممالک کے مختلف علاقوں کی تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ سادہ اور بیانیہ انداز تحریر سے سامنے آنے والی اس کتاب میں مختلف مواقع کی مناسبت سے شعری تاثرات بھی شامل کیے گئے ہیں۔

حفیظہ طاہر گھوٹیہ نے حجاز مقدس کا سفرنامہ "من مکہ دید مدینہ" کے عنوان سے پیش کیا۔ بہاول پور سے شائع ہونے والا یہ سفرنامہ شعری رنگ میں ہونے کے باعث موجود میں انفرادیت کا حامل ہے۔ اس منظوم سفرنامہ کو "روانگی"، "حجاز ستان"، "عرب"، "کعبہ"، "دعا"، "زم زم"، "مدینہ"، "مکہ"، "حج" اور "واپسی" جیسے عنوانات کے حوالے سے پابند نظم کی ہیئت میں تحریر کیا گیا ہے۔ تمام نظمیں ایک ہی بحر میں تحریر کی گئی ہیں اور ہر نظم میں چار چار مصرعے کے بند شامل ہیں۔

انشائیہ

سرائیکی ادب میں انشائیہ نگاری کی ابتدا اخبارات و رسائل سے ہوئی۔ جہاں تک اس صنف کے حوالے سے شائع ہونے والی کتب کا تعلق ہے تو اَسّی کی دہائی میں سامنے آنے والی ابتدائی کتاب "سرائیکی انشائیے" محمد اسلم میتلا کی کاوش ہے۔ بعد ازاں محمد اسلم میتلا کی تخلیق "وسیب رنگ" بھی سامنے آئی۔ ان کتب میں شامل انشائیے سادہ اسلوب اور اختصار کی صفت پر پورا اترتے ہیں۔ یہاں تک کہ انشائیہ کے عنوانات بھی یک لفظی ہونے کے باعث انفرادیت کے حامل ہیں۔

انشائیہ کی تکنیک اور موضوعاتی خوبیوں سے مزین ڈاکٹر محمد نسیم ملک کا مجموعہ "جھلار" خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ سرائیکی ثقافت کی ترجمان اور سرائیکی کے مخصوص الفاظ کی نمائندگی کرنے والی یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان سے "خواجہ فرید ایوارڈ" حاصل کر چکی ہے۔

دلشاد کلانچوی کی کتاب "نِچھ پیا اوسوتا" اور ابن الامام شفتر کا مجموعہ "ڈُسکیاں تے لشکارے" جزوی طور پر انشائیہ کی نمائندگی کرنے والی کتب ہیں۔ علاوہ ازیں حاجی رانا سردار احمد سعید کی طنزیہ و مزاحیہ کتب "کل وسیب" اور "آسوں پاسوں" میں انشائیہ کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔ جب کہ سید ابو البشر شاہ جیلانی کی کتاب "مجموعہ اقوال" دس انشائیوں پر مشتمل ہے جس میں سندھی زبان کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر گل عباس اعوان کا مجموعہ "سوجھلا" معاشرتی زندگی اور سماجی ماحول سے جُڑا ہوا ہے۔ جس کے عام فہم عنوانات اور سادہ اسلوب انشائیہ کی فنی خوبیوں کی اہم مثال ہیں۔

سرائیکی نثری ادب میں عبدالباسط بھٹی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ سفرنامہ، افسانہ اور خاکہ کی اصناف کے ساتھ ساتھ انشائیہ بھی ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ ۲۰۱۱ء میں ان کی کتاب "اولڑاں" میں پائی جانے والے بیس سے زیادہ انشائیے سرائیکی وسیب کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ خالد اقبال کی کتاب "تُسکار" ملتان سے شائع ہوئی جس میں بیس انشائیے شامل ہیں۔ روز مرہ زندگی میں آئے دن سامنے آنے والے موضوعات کو ان انشائیوں میں عوامی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مریم

گھوٹیہ کی کتاب "اکھ" انشائیے کی صنف میں اضافے کے ساتھ ساتھ سرائیکی کے خواتین ادب میں بھی اہم اضافہ ثابت ہوئی۔ اکھ ہال، گھنڈ، ہتھ، کوڑ، گکھل، زنانی، مسئلہ، میڈا سکول، کتاب، بخار جیسے عنوانات سماج سے جڑت کو ظاہر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نواز کاوش کی کتاب "پارتاں" میں انیس انشائیے شامل کیے گئے ہیں، جس میں پائے جانے والے انشائیے "سیاست دان"، "مہمان"، "دانشور"، "طالب علم"، "اشتہار"، "بیمار"، "سرکاری ملازم"، "مجبور شوہر"، "استاذ"، "انتظار" اور "موسم" جیسے عنوانات سرائیکی ادب کا اردو ادب سے تعلق واضح کرتے ہیں۔

ڈیرہ اسماعیل خان کے مضافاتی علاقہ ڈھکی سے تعلق رکھنے والے قلم کار فقیر فریدی کی دو کتابیں "تر کنیاں" اور "چکلوڑیاں" کے عنوانات سے سامنے آئیں۔ "تر کنیاں" انشائیہ کا ایسا مجموعہ ہے کہ جس کے عنوان کے حوالے سے لفظ "تر کنی" کو بھی انشائیہ کے متبادل کہا جاسکتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل انشائیے اردگرد کے موضوعات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جس میں یہ بھی کوشش کی گئی کہ انشائیہ کا عنوان مختصر سے مختصر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر عنوانات یک لفظی حوالے سے سامنے آئے ہیں۔ دوسرے مجموعے "چکلوڑیاں" کے ہلکے پھلکے مضامین بھی انشائیہ کے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سرائیکی ضرب الامثال، محاورات اور ٹھیٹھ الفاظ و اصطلاحات کے باعث کتاب کے آخر میں فرہنگ بھی شامل ہے۔

پروفیسر ملک منظور احمد نمود کے انشائیوں کا مجموعہ "بیریں دے بیر" ۲۰۲۰ء میں سامنے آیا۔ انشائیہ نگار نے آسان زبان اور مختصر جملوں کے استعمال کے باعث اپنی تحریر میں انفرادیت پیدا کی ہے نیز انشائیہ کے موضوعات کو مقامیت سے جوڑتے ہوئے تہذیب و ثقافت کے مختلف رنگ اجاگر کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔

جہاں تک رسائل و جرائد کا تعلق ہے تو ماہنامہ "سرائیکی ادب" ملتان، سہ ماہی "سرائیکی" بہاول پور، ماہنامہ "سویل" بہاول پور، کتابی سلسلہ "سنجان" رحیم یار خان، کتابی سلسلہ "سنجان" اسلام آباد، کتابی سلسلہ "دھوں دھیڑے" شادن لُنڈ (ڈیرہ غازی خان)، کتابی سلسلہ "سوجھل سویل" لیہ، روزنامہ "کوک" ڈیرہ غازی خان، ہفت روزہ "صدائے مخدوم" مظفر گڑھ، ہفت روزہ "انکشاف" تونسہ، روزنامہ "خبریں" ملتان (سرائیکی ادب ایڈیشن) اور دیگر متعدد اخبارات و رسائل میں سرائیکی انشائیے

سامنے آتے رہے ہیں۔ اگر اخبارات و رسائل میں لکھنے والے انشائیہ نگاروں کو دیکھا جائے تو نذیر علی شاہ، طاہرہ تنسوی، شمیم سیال، عمر علی خان بلوچ، انجم الاشاری، اسلم قریشی، زبیر رانا، حبیب فائق، جاوید احسن، رحیم طلب، اللہ بخش یاد، ریحانہ یاسمین، ناصر فریدی، راہی گبول، منظور اعوان، دین محمد شاد، عباس ملک، ریاض بھٹی، حفیظ گھوٹیہ، حفیظ الرحمٰن خان، اللہ بچایا عنبر، امین سہیل ملتانی، راشد عزیز بھٹہ، لیدا لعل (اشرف بھٹی) اور حمید الفت ملغانی (راقم) کے نام نمونے کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

خاکہ

سرائیکی ادب میں خاکہ نگاری کا سلسلہ اخبارات و رسائل سے ہوتا ہوا کتابی شکل تک پہنچا۔ اس سلسلے کی ابتدائی کتب پیش کرنے والے خاکہ نگاروں میں سید انیس شاہ جیلانی اور ناصر فریدی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

انیس شاہ جیلانی کے دو مجموعے "مبادا دیکھنس" اور "مٹر دگت" کے عنوانات سے سامنے آئے۔ "مبادا دیکھنس" میں سرائیکی قلم کاروں میں سے نگاہی بہاول پوری، فیض محمد دلچسپ، بخت علی سرور اور رفیق ساحل کے ساتھ ساتھ اردو اور سندھی زبان کے متعدد اہل قلم کے خاکے شامل ہیں۔ جب کہ انیس شاہ جیلانی کی اس کتاب میں مقامی سیاست دانوں کے شخصی خاکے پیش کرنے کی بھی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ دوسرا مجموعہ "مٹر دگت" بھی چار سرائیکی لکھاری شاغل صدیقی، دلشاد کلانچوی، ممتاز حیدر ڈاہر اور قاسم جلال کے علاوہ اردو کے قلم کاروں شفیق اختر، مولوی عبدالحق، رئیس امروہوی، یوسف دہلوی اور زاہدہ حنا کے حوالے سے تحریر کیے خاکوں پر مشتمل ہے۔ انیس شاہ کا طرزِ تحریر چٹخارے دار ہونے کے باعث مزید نکھار پیدا کر دیتا ہے۔

ناصر فریدی کی کتاب "جواں تاں ڈیکھ" میں شامل خاکے مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ اس کتاب میں دیگر شخصی خاکوں کے ساتھ ساتھ سرائیکی قلم کاروں میں سے انیس شاہ جیلانی، ممتاز حیدر ڈاہر، سجاد حیدر پرویز اور رفیق ساحل کے نام شامل ہیں۔

عبدالباسط بھٹی نے "ڈُکھ ڈولی" کے عنوان سے خاکے ۱۹۹۵ء میں پیش کیے۔ اکادمی ادبیات پاکستان سے خواجہ فرید ایوارڈ حاصل کرنے والی اس کتاب میں ایسی تلخ باتیں بھی پیش کی ہیں جنھیں وہ تلخ حقائق سمجھتے تھے۔ اس کتاب کو سرائیکی قلم کاروں کی خاکہ نگاری تک محدود رکھا گیا جس میں بیشتر اہل قلم کا تعلق بہاول پور ڈویژن سے ہے۔ اس کتاب میں دلشاد کلانچوی، انیس شاہ جیلانی، نقوی احمد پوری، قیس فریدی، نصر اللہ خان ناصر، مظہر مسعود، ظفر لاشاری، نذیر چنار، سجاد حیدر پرویز، رفیق احمد پوری، ممتاز عاصم، جہانگیر مخلص، رحیم طلب اور سرور قریشی کے خاکے موجود ہیں۔

CS CamScanner

عبدالباسط بھٹی کی خاکہ نگاری پر مشتمل دوسری کتاب "ساڈول سوتے" ۲۰۱۳ء میں سامنے آئی۔ اس دوران میں عبدالباسط بھٹی بہاول پور سے ملتان آ چکے تھے اس لیے یہ کتاب پورے وسیب کے ادیبوں، دانشوروں اور فن کاروں کے شخصی خاکوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ خاکے کتابی شکل میں سامنے آنے سے پہلے روزنامہ "خبریں" ملتان کے "سرائیکی ادب" ایڈیشن میں شائع ہوتے رہے۔ اس کتاب میں سفیر لاشاری، جاوید چانڈیو، شوکت مغل، ذوالفقار علی بھٹی، راحت بانو، حفیظ خان، مظفر بخاری، رفعت عباس، محبوب تابش، شمیم عارف قریشی، خالد خان، افضل مسعود، علمدار حسین بخاری، صابر چشتی، سلیمان سہو، مقبول گیلانی، عاشق بزدار، جاوید اختر بھٹی، اسلم رسول پوری، عبداللطیف بھٹی، مجاہد جتوئی، دلنور نور پوری، ظہور دھریجہ، محمود مہے اور الطاف خان ڈاہر جیسی شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔

محمد اسلم میتلا کی کتاب "لعل سرائیکی دے" میں سرائیکی ادب سے تعلق رکھنے والے ان ادیبوں اور دانشوروں کے خاکے پیش کیے گئے جو داعی اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں۔ اس کتاب میں مولانا نور احمد خان فریدی، ڈاکٹر مہر عبدالحق، دلشاد کلانچوی، عتیق فکری، ریاض رحمانی، جانباز جتوئی، حسن رضا گردیزی، خلیق ملتانی، غلام حسین زائر، صدیق طاہر، نسیم لیہ، نور محمد سائل، امید ملتانی، حبیب فائق، سفیر لاشاری، عمر کمال خان، شمشیر حیدر ہاشمی، ارشد ملتانی، محمد اسماعیل احمدانی، مولانا غلام محمد فریدی چاچڑانی، غلام حسن حیدرانی، اے ڈی نسیم ملک، انقلابی احمد پوری، عثمان رضوانی، سرور کربلائی، غلام یسین فخری، ممتاز حیدر ڈاہر، تحسین سبائے والوی، محمد بشیر احمد الہ آبادی اور سراج الدین سانول کے خاکے شامل ہیں۔ ۲۰۰۹ء میں شائع ہونے والی اس کتاب کے آخر میں مرحومین قلم کاروں کے علاوہ محمد اسلم میتلا نے ذاتی خاکہ بھی پیش کیا۔ اس خاکے کو شامل کرتے ہوئے کتاب کا صفحہ نمبر نہیں دیا گیا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ۲۰۱۰ء میں محمد اسلم میتلا کا بھی انتقال ہو گیا اور وہ بھی مرحومین میں شامل ہو گئے۔

سلیم نیازی نے "یاداں عذاب یاداں" کے عنوان سے خاکے پیش کیے۔ یہ خاکے سماج میں پائے جانے والے ان کرداروں کی نمائندگی کرتے ہیں جنھیں عموماً عام کردار سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ گویا سلیم نیازی نے عام کرداروں کو خاص بنا کر اپنی تحریر کو منفرد بنا دیا۔

المختصر "خاکہ نگاری" کی صنف سرائیکی میں مختصر ہونے کے باوجود اس قدر جان دار ہے کہ اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنف کو قومی سطح کے ایوارڈ تک رسائی کا اعزاز حاصل ہے۔

CamScanner

دیگر اصناف و موضوعات

آپ بیتی

آپ بیتی کو سرائیکی میں متعارف کراتے ہوئے محمد رمضان طالب نے "میں کون؟" کے عنوان سے ۲۰۰۶ء میں خودنوشت سوانح کو کتابی شکل دی اس کتاب میں مصنف نے زندگی کے ناقابل فراموش واقعات کو سادگی سے پیش کیا۔ آپ بیتی میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کچھ شعری حوالے بھی شامل ہیں۔

محمد اسماعیل احمدانی کی تحریر کردہ آپ بیتی "یادیں دا خاپ گل" ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی۔ جس میں شامل علاقائی انداز خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ قلم کار کی وفات کے بعد سامنے آنے والی اس کتاب میں شامل علامات ابواب کے عنوانات سے بھی عیاں ہیں۔

ظہور دھریجہ کی کتاب "مہاگ" ۲۰۲۰ء میں شائع ہوئی جس میں اپنی جنم بھومی دھریجہ نگر (ضلع رحیم یار خان) میں گزارے ابتدائی پندرہ برس کی آپ بیتی شامل ہے۔

خطوط نویسی

خطوط نویسی کا سلسلہ تو زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے لیکن سرائیکی خطوط کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی ابتدا امیر کا چیلوی کی مرتبہ کتاب "چٹھی میرے ڈھول دی" سے ہوئی جس میں انگریزی، سندھی، پنجابی اور سرائیکی میں لکھے ہوئے خطوط شامل ہیں۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ۱۹۸۹ء اور دوسرا حصہ ۱۹۹۵ء میں سامنے آیا۔ دونوں حصوں میں سرائیکی خطوط شامل کیے گئے ہیں۔

سرائیکی قلم کاروں کے منتخب خطوط کو محمد اسلم میتلا نے ۲۰۰۷ء میں "زنداں بھری چنگیر" کے عنوان سے پیش کیا۔ جسے سرائیکی خطوط کی باقاعدہ طور پر سامنے آنے والی منفرد کتاب کہا جا سکتا ہے۔

شوکت مغل کی ترتیب، تعارف اور ترجمہ کے حوالے سے ۲۰۱۹ء میں سامنے آنے والا خطوط کا مجموعہ "انیس علم، امام مجلس ادب" سید انیس شاہ جیلانی کے ایسے خطوط پر مشتمل ہے جو شوکت مغل کے نام تحریر کیے گئے تھے۔

CamScanner

فنی ادب

فنی ادب کے حوالے سے محبوب تھنگوی کی دو کتب "موٹر کار" اور "کلرکی" کے عنوانات سے بیسویں صدی کی آخری دہائی میں سامنے آئی ہیں۔ "موٹر کار" کے مختلف عنوانات سادہ انداز میں تکنیکی مہارت کا پتہ دیتے ہیں۔ جب کہ "کلرکی" میں دفتری معاملات کی وضاحت شامل ہے۔

ڈائریکٹری

سجاد حیدر پرویز کی ترتیب و تہذیب سے سامنے آنے والی "ڈائریکٹر سرائیکی مصنفین" ۱۹۹۳ء میں منظرِ عام پر آئی۔ جو کہ ۳۷۵ شاعروں اور ادیبوں کے علمی، ادبی اور سوانحی کوائف پر مشتمل ہے۔

مجاہد بھٹی کی مرتب کردہ "اسلام آباد: جھوک ٹیلی فون ڈائریکٹری" میں اسلام آباد میں مقیم سرائیکی احباب کے فون نمبر اور پتے درج کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں سرائیکی وسیب کی تاریخ، جغرافیہ اور زبان و ادب کے منتخب قلم کاروں کا قلمی انتخاب بھی ڈائریکٹری کا حصہ ہے۔

فلسفہ

اکرم میرانی کی کتاب "حق وطنی فلاسفی" سرائیکی زبان میں پیش کی جانے والی اس موضوع کی اولین تحریر ہے۔ ۲۰۱۳ء میں سامنے آنے والی اس کتاب میں یونانی فلسفہ، ہندوستانی فلسفہ، عبرانی عقائد، جدید فلسفہ، تصوف، ماحولیاتی فلسفہ اور حق وطنی فلسفہ جیسے عنوانات زیرِ بحث لائے گئے۔

نثری مجموعہ جات

شعری کلیات کی طرز پر نثری مجموعہ جات بھی سرائیکی ادب میں سامنے آئے ہیں۔ ان مجموعہ جات میں عبدالباسط بھٹی کی تخلیقات پر مبنی کتاب "عبدالباسط بھٹی لکھتاں دے تروار" کے عنوان سے الطاف خان ڈاہر نے مرتب کی۔ ۲۰۱۵ء میں شائع ہونے والے اس مجموعے میں عبدالباسط بھٹی کی کتب "کو کدے چندے گرلاندے پاندھی" (سفرنامہ)، "ڈکھ ڈولے" (خاکے)، "دو ڈ چھاوریا" (افسانے)، "الاہاں" (انشائیے) اور "سانول سلونے" (خاکے) کو یکجا کر دیا گیا۔

۲۰۱۷ء میں ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کی نثری کتب کو ذی شان حیدر اور ذی حشم حیدر نے ترتیب دے کر "رنگی دے رنگ" (جلد اول) کے عنوان سے شائع کیا۔ جس میں ان کے افسانے، خاکے، ڈرامے، سفرنامے، کالم، قصے، مزاح اور تراجم کو ایک جلد میں سمو دیا گیا۔

تجزیاتی مطالعہ

CamScanner

لسانیات

سرائیکی لسانیات کے بارے میں ابتدائی کتب مستشرقین نے تحریر کی ہیں جن کو نئے سرے سے بھی شائع کیا جا چکا ہے۔ زبان کے حوالے سے مستشرقین کے مختلف نظریات کے باعث سرائیکی ماہرین نے بھی اس جانب توجہ مبذول کی۔ انیسویں صدی عیسوی کے "آخری عشرہ" میں سامنے آنے والا قاضی فخر الدین راضی کا "ملتانی قیود" اس کی ایک مثال ہے اور بعد ازاں یہ سلسلہ چلتا رہا۔

قیام پاکستان کے بعد سرائیکی لسانیات کی اہمیت کو اجاگر کرنے والے ماہرین میں ڈاکٹر مہر عبدالحق اور محمد بشیر احمد ظامی بہاول پوری کے نام ابتدائی قلم کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ جب کہ اس موضوع کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنے والوں میں محمد اسلم رسول پوری اور شوکت مغل کے نام خصوصی طور پر لیے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق" ڈاکٹر سید عبداللہ کی زیر نگرانی لکھا گیا جو ۱۹۵۳ء میں مکمل ہوا۔ اور انھیں ۱۹۵۷ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ بعد ازاں یہی مقالہ اردو اکیڈمی بہاول پور نے ۱۹۶۷ء میں شائع کر دیا۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق کا یہ مقالہ سرائیکی لسانیات کے لیے ٹھوس شواہد مہیا کرتا ہے۔ اُن کی دوسری کتاب "سرائیکی اور اس کی ہمسایہ علاقائی زبانیں" میں سرائیکی کا دیگر پاکستانی زبانوں سے تعلق واضح ہوتا ہے جس سے مختلف زبانوں کی شناخت کو گرامر کے اصولوں کے مطابق واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے کی کتاب "سرائیکی دے قاعدے قانون" میں محض سرائیکی زبان کے قواعد پر زور دیا گیا ہے۔ جب کہ لسانیات کے موضوع کی مناسبت سے "سرائیکی دیاں مزید لسانی تحقیقاں" میں تلاش و جستجو کے کئی زاویے شامل ہیں۔ علاوہ ازیں خواجہ فرید کے کلام پر مبنی "لغاتِ فریدی" کو بھی لسانیات کا حصہ کہا جا سکتا ہے۔

محمد بشیر احمد ظامی بہاول پوری نے لسان اور لسانیات کو خصوصی اہمیت دی۔ ۱۹۶۲ء میں سامنے آنے والی ان کی کتاب "بہاول پوری ملتانی زبان و ادب" سرائیکی زبان کے تعارف پر مبنی ہے۔ جبکہ ۱۹۶۳ء میں سرائیکی صرف و نحو کے بارے میں "گلستانِ قواعد" کی اشاعت عمل میں آئی۔ ۱۹۶۵ء میں

پیش کی جانے والی کتاب "لغات سرائیکی" ۱۹۶۸ء میں سامنے آنے والا "سرائیکی زبان دا قاعدہ" اور اسی سال ہی کی پیش کش "سرائیکی زبان کا ارتقا" کے علاوہ "سرائیکی اردو بول چال" بھی زبان اور زبان دانی کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنے والی تصنیفات میں شامل ہیں۔

سرائیکی زبان کے ماہرین لسانیات میں محمد اسلم رسول پوری کا نام خاصا معروف ہے۔ ان کی ابتدائی تحریر ۱۹۷۲ء میں "سرائیکی رسم الخط کی مختصر تاریخ" کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کی گئی۔ ۱۹۷۷ء میں ان کی مختصر تحریر "سرائیکی زبان بارے سوال جواب" شائع ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں "سرائیکی قاعدہ" چھپ کر آیا اور ۱۹۸۰ء میں "ساڈی کائنات" کے عنوان سے تعلیم بالغاں کے بارے میں کتاب شائع ہوئی۔ ان ابتدائی تحریروں کے بعد ۱۹۸۰ء میں "سرائیکی زبان، اوندا رسم الخط تے آوازاں" کی اشاعت سرائیکی لسانیات کے موضوع کی اہم کتاب کے طور پر سامنے آئی۔ جس کے نایاب ہو جانے کے باعث ۲۰۰۷ء میں اسے اشاعت مکرر کے حوالے سے شائع کیا گیا۔ اکیسویں صدی میں سامنے آنے والی کتب "لسانی مضامین"، "سرائیکی دا نحوی کار آوازاں" اور "سرائیکی زبان تے لسانیات" کی اشاعت کو محمد اسلم رسول پوری کی لسانی خدمات کا بھرپور اظہار کہا جا سکتا ہے۔

شوکت مغل کی پہلی کتاب "قدیم اردو لغت اور سرائیکی زبان" ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب ڈاکٹر جمیل احمد جالبی کی کتاب "قدیم اردو کی لغت" سے اخذ کیے گئے الفاظ کی توضیحات پر مشتمل ہے۔ ۲۰۰۳ء میں اسے دوبارہ شائع کرتے ہوئے مسعود حسین خان اور غلام عمر خان کی کتاب "دکنی اردو لغت" سے بھی الفاظ اخذ کیے گئے اور عنوان بدل کر "قدیم سرائیکی اردو لغت" تجویز کیا گیا۔ بعد ازاں "سرائیکی قاعدہ" بھی سامنے آیا۔ جس کی بار بار اشاعت اور پاکٹ سائز تک کے ایڈیشن سامنے لانے کے باعث یہ قاعدہ سرائیکی پڑھنے لکھنے والوں کی توجہ کا مرکز رہا۔ ۱۹۹۰ء میں ان کی کتاب "اردو میں سرائیکی زبان کے انمٹ نقوش" شائع ہوئی جس میں حافظ محمود شیرانی کے نظریہ "پنجاب میں اردو" کے مقابلے میں ڈاکٹر مہر عبدالحق کے نظریہ "ملتان میں اردو" کی تائید کی گئی۔ سرائیکی کے ضرب الامثال کو محفوظ کرنے کے لیے "سرائیکی اکھان" کی تین ضخیم جلدیں شوکت مغل کی پہچان بن گئیں جن میں چودہ ہزار سے زیادہ ضرب الامثال شامل ہیں۔ "سرائیکی محاورے" کی دو جلدیں، "آمدنامہ المعروف سرائیکی مصادر"، "اصطلاحات پیشہ وراں" اور "شوکت اللغات" کی اشاعت سرائیکی زبان کی قدامت اور وسعت کی دلالت کرتی ہیں۔ "سرائیکی املا دے مسئلے"، "آؤ سرائیکی پڑھوں تے لکھوں" اور "سرائیکی

دیاں خاص آوازاں دی کہانی" کے عنوانات سے سامنے آنے والی کتب میں املا اور رسم الخط کی توضیحات
شامل ہیں۔ "اردو سرائیکی مترادفات"، "سرائیکی زبان وچ کتابیہ تے قرتیہ" اور "سرائیکی نامہ" جیسی
کتب بھی شوکت مغل کی سرائیکی لسانیات سے دلچسپی کے باعث سامنے آئی ہیں۔

مستشرقین کی کتب اکیسویں صدی کے آغاز سے قبل نایاب ہو چکی تھیں، جس کے باعث ان
کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری شوکت مغل نے اپنے سر لی۔ ۱۸۸۱ء میں شائع ہونے والی ای او برائین
کی رومن رسم الخط میں تحریر کی گئی سرائیکی کتاب کو "سرائیکی اردو لغت" کے عنوان سے سرائیکی رسم الخط میں
پیش کیا گیا۔ ای او برائن کی دوسری کتاب "Glossary o' the Multani Language" بھی کلیدی
حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کو بھی شوکت مغل نے ایڈیشن کے طور پر سامنے لانے میں کامیاب ہوئے۔
اینڈریو جیوکس کی رومن رسم الخط اور انگریزی میں پیش کی گئی لغت کی اہمیت کی بنا پر شوکت مغل نے سرائیکی
روپ دیتے ہوئے "سرائیکی اردو لغت" کے عنوان سے پیش کیا۔ جب کہ انگریزی رسم الخط کے حوالے
سے بھی "Siraiki English Dictionary" کے عنوان سے پیش کیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں سامنے آنے والی
سر جارج گریرسن کی معروف تصنیف "Lahanda Language" کو شوکت مغل نے از سرِ نو ترتیب
دیتے ہوئے "The Siraiki Language" کے عنوان سے پیش کیا۔ اسی طور سے روس کے ماہر لسانیات
لیاسے سمرنوف کی کتاب "The Lahandi(Siraiki) Language" بھی نئے انداز سے سامنے آئی۔
آر ایف برٹن کی تصنیف "A Grammer of Jutki/ Balochi Dilect" کو شائع کرتے ہوئے "A
Grammer of Siraiki Language" کا عنوان دیا گیا۔ جس کے مقدمے میں شوکت مغل نے کتاب
کی اہمیت و ضرورت کے علاوہ "جٹکی" اور "سرائیکی" زبان کی وضاحت بھی پیش کی۔

لغت کی دیگر ایسی اہم کتب جو مقامی ماہرین نے تحریر کیں ان میں مولوی خدا بخش کی کتاب "
نصاب ضروری" کو ڈاکٹر محمد انور ابو بحری ملتانی کی تدوین کے بعد سامنے لانا، دلشاد کلانچوی کی دو جلدوں
پر مشتمل لغات دلشادیہ میں اردو سے سرائیکی اور سرائیکی سے اردو کا شامل ہونا، فدائے الطہر اور اسلم قریشی
کی کتاب "نویکلی سرائیکی اردو ڈکشنری"، نذیر احمد کی "حرف تسلی" میں انگریزی الفاظ کا سرائیکی ترجمہ،
محمد دین گانگا کی کتاب "سرائیکی تے انگریزی"، قیس فریدی کی تحریر "چند سرائیکی اصطلاحات و
مترادفات"، غلام حر خان کندرانی کی کاوش "پوچھی: نویکلی سرائیکی لغت" اور خاص طور پر محمد سعد اللہ کھتران
کی تیار کردہ "پہلی وڈی سرائیکی لغت" شامل ہیں۔

سید علی مستانی کی تحریر "ملتانی زبان کیا ہے؟"، اختر وحیدی کی کتاب "ڈو دو گوہر"، عبدالحمید شفیق لکڑی کی تصنیف "العتیق العتیق"، سید نور علی ضامن حسینی کی کتاب "معروف سرائیکی"، اختر علی بلوچ کی تحریر "سرائیکی زبان"، سراج الدین ساقوال کا کتابچہ "سرائیکی معیاری زبان دی اہمیت"، عبداللہ عرفان کی تحقیق "سرائیکی زبان لاطینی اکھراں وچ" اور جمشید کمتر کی کتب "سرائیکی سمل" اور "سرائیکی سہڑا سال" سرائیکی زبان کی تاریخ کے حوالے سے اہم دستاویزات کا درجہ رکھتی ہیں۔

احسن واگھا کی ایم فل کے مقالے پر مبنی کتاب "The Seraiki Language Its growth and Development"، سید ناصر عباس رضوی کی کتاب "بولی بھوم دی سنجان" اور دلشاد کلانچوی کی تحریر "سرائیکی لسانیات" لسانیاتی موضوع کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ڈاکٹر احسن واگھا کی تصنیف "اکھر شبدے" کا دوسرا حصہ، بشیر احمد بھایہ کی کتاب "سرائیکی قواعد تے زباندانی"، امان اللہ کاظم کے "جامع سرائیکی قواعد" اور خالد اقبال کی تحریر "سرائیکی زبان: قواعد تے زبان دانی" میں سرائیکی زبان کے صرف و نحو کی بحث پر زور دیا گیا ہے۔ جب کہ دلشاد کلانچوی کی کتاب "سرائیکی شاعری دے اوزان"، اکرم قریشی کی کاوش "ادب تے عروض"، نواز شجاع نوری کی تصنیف "شاعری دے گُر" اور عبداللطیف بھٹی کی تحریر "چھند پتری" شعری قواعد کی نمائندگی کرتی ہیں۔ راؤ سردار احمد سعید کی کتاب "سرائیکی زبان مع اکھان"، سید انجم گیلانی کی تصنیف "سرائیکی محاورے اور ضرب الامثال" اور امان اللہ کاظم کی لکھت "کن نہ" میں ضرب الامثال اور محاورات کا انتخاب اور توضیحات شامل ہیں۔

اجمل مہار ابن اکبری کی کتاب "حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مہر عبدالحق: لسانی نظریات ایک مطالعہ"، نسیم اختر کی کاوش "سرائیکی ضرب الامثال اور سرائیکی وسیب"، ڈاکٹر مقبول گیلانی کی تحریر "سرائیکی زبان و ادب" اور عطا الاکبر بلوچ کی کتاب "ترائیمی: سرائیکی زبان و ادب" ایسی کتب ہیں جو کہ کسی نہ کسی حوالے سے لسانیاتی تحقیق سے متعلق ہیں۔

فریدیات

خواجہ غلام فرید (۱۹۰۱ـ۱۸۴۵ء) کو سرائیکی ادب میں اہم مقام حاصل ہونے کے باعث "فریدیات" کا موضوع سرائیکی ادبی دنیا کی منفرد پہچان ہے۔ فریدیات کے اس موضوع کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ خواجہ فرید: فن اور شخصیت

۲۔ کلام فرید: تدوین و ترجمہ

۱۔ خواجہ فرید: فن اور شخصیت

خواجہ غلام فرید کے فن اور شخصیت کے حوالے سے کتب ان کی زندگی میں بہادر شاہ ظفر کے پوتے شہزادہ مرزا احمد اختر نے تحریر کیں جو کہ شائع بھی ہوئیں۔ میر حسان الحیدری نے عہد فرید میں شائع ہونے والی مرزا احمد اختر کی دس کتب کے عنوانات اس طرح گنوائے ہیں۔ "مناقب فریدی (جلد اول)، مناقب فریدی (جلد دوم)، سفرنامہ، آئین فریدی، فیضان فریدی، مکتوبات فریدی، پنج رقعہ فریدی، سلاسل فریدی، اعمال چشتیہ فریدیہ، مخزن المعالجات فریدی"(۱)۔

خواجہ غلام فرید کے وصال کے بعد بھی مرزا احمد اختر نے "فریدیات" کے بارے میں کتب تحریر کی ہیں۔ ان کی تحریر کردہ پانچ کتب کو "خواجہ فرید" کے عنوان سے مرتب کر کے جاوید چانڈیو ۱۹۹۹ء میں سامنے لائے۔ اس طرح یکجا ہو کر سامنے آنے والی کتب میں "مناقب فریدی (جلد اول)"، "مناقب فریدی (جلد دوم)"، "سفرنامہ فریدی"، "کشف الخلافہ" اور "سوانح عمری حضرت فرید ثانی" شامل ہیں۔ "سوانح حضرت فرید ثانی" کو ۱۹۹۹ء ہی میں خواجہ معین الدین کوریجہ نے بھی "کوان فرید فقیر" کے عنوان سے مرتب کر کے شائع کرایا۔ ۱۹۱۹ء میں سامنے آنے والی محمد انور فیروز کی کتاب "گوہر شب چراغ" کو جاوید چانڈیو کی ترتیب سے ۱۹۹۹ء میں اشاعت مکرر کے طور پر سامنے لایا گیا جسے خواجہ غلام فرید کی شخصیت اور فن کے حوالے سے اولین کتاب کہا جاتا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں ملتان سے سامنے آنے والی بریگیڈیر نذیر علی شاہ کی کتاب "Farid" انگریزی کے ۱۵۹ اور اردو کے ۱۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ

CamScanner

کتاب عالمی سطح پر فریدیت کو متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ علامہ تسیم طالوت کا تحریر کردہ طویل مقدمہ مولانا عزیز الرحمن کے ترجمہ کردہ "دیوان فرید" کا حصہ بننے کے بعد ۱۹۹۳ء میں بزم ثقافت ملتان کی جانب سے "خواجہ غلام فرید: آثار و احوال" کے عنوان سے الگ کتابی شکل میں بھی سامنے آیا۔ ۱۹۶۳ء ہی میں اردو اکادمی بہاول پور کی جانب سے مسعود حسن شہاب کی کتاب "خواجہ غلام فرید" شائع ہوئی جس میں خواجہ فرید کی حیات و شاعری کو شامل کیا گیا ہے۔ مسعود حسن شہاب دہلوی کے بقول:

> "خواجہ صاحب کا نام ان کے والد نے شیخ فریدالدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کے نام پر غلام فرید رکھا تھا اور یہ شاید اسی نام کا اثر تھا کہ وہ عرفان و شعر کے بلند مقام پر پہنچے۔ بابا فرید اور خواجہ فرید کے زمانے میں تقریباً سات سو سال کا فاصلہ ہے لیکن یہ بُعد روحانی دنیا میں کیا حقیقت رکھتا ہے چنانچہ خواجہ صاحب پر اپنے ہم نام ولی کا عکس اس طرح پڑا جیسے آفتاب اپنی ہزاروں میل کی بلندی سے بھی دنیا کے تاریک سے تاریک گوشے کو منور کر دیتا ہے۔ بابا فرید نے ملتانی زبان کی شاعری کو جو چراغ پہلے پہل روشن کیا تھا اسے خواجہ غلام فرید نے نہ صرف روشن کیے رکھا بلکہ فریدی تصرفات کے سوز سے اس کی تابانی میں بے حساب اضافہ کیا۔" (۴)

متذکرہ بالا کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اسے ۱۹۷۳ء میں "خواجہ غلام فرید: حیات و شاعری" کے عنوان سے اشاعت دوم کے طور پر پیش کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں رفیق خاور جسکانی کی کتاب "روح فرید" شائع ہوئی۔ جس میں خواجہ فرید کے فکر و فن کے حوالے سے ایسے مضامین شامل ہیں جو قبل ازیں اخبارات و رسائل کی زینت بھی بن چکے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں دلشاد کلانچوی کی کتاب "کون فرید فقیر" شائع ہوئی جس میں خواجہ غلام فرید کی شاعری کے مختلف رنگ واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔ علاوہ ازیں کتاب کے آخر میں خواجہ غلام فرید کی حیات کو معروضی انداز میں تاریخ وار شامل کیا گیا۔ یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے سالانہ "خواجہ فرید ایوارڈ" کی حق دار ٹھہری۔ اس کتاب کی اہمیت کے باعث اسے مکرر کے طور پر سرائیکی ادبی بورڈ ملتان کی جانب سے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا گیا۔ "فریدیات" کے عنوان سے شائع ہونے والی دلشاد کلانچوی کی کتاب نصابی ضرورت کے مطابق سامنے آئی۔ ڈاکٹر انوار احمد کی کتاب "خواجہ فرید کے تین رنگ" بزم ثقافت ملتان کی اشاعت کے طور پر ۱۹۸۵ء میں سامنے آئی

جس کو ز شدہ ہدایت، حسن و عشق اور روحی رنگ کے موضوعات میں تقسیم کر دیا گیا۔ ۱۹۸۸ء میں سامنے آنے والی ڈاکٹر مہر عبدالحق کی کتاب "فکرِ فرید" تنقیدی حوالے کے بیس سے زیادہ مضامین پر مشتمل ہے جس میں خواجہ غلام فرید کے نظریات اور فکر و فن کے موضوعات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ عمرانہ پروین تحسین کی کتاب "چاہت فرید" کو فریدیات کے موضوع کے بارے میں کسی خاتون کی پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ یہ مختصری کتاب (ص ۵۶) خواجہ فرید علمی ادبی بورڈ لاہور کی جانب سے شائع ہوئی۔

بیسویں صدی کے آخری عشرے میں شائع ہونے والی کتب میں خانوادہ فرید کے قلم کار خواجہ طاہر محمود کوریجہ کی کتاب "خواجہ فرید اور ان کا خاندان" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ خواجہ غلام فرید کے احوال و آثار کے بارے میں اسے مستند کہا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں خانوادہ فریدی سے تعلق رکھنے والے خواجہ معین الدین کوریجہ کے انٹرویو کے حوالے سے سامنے آنے والی کتاب "احوال و واقعات حضرت خواجہ غلام فرید" اور مولانا نور احمد خان فریدی کے مرتب دیوان فرید کے دیباچے پر مشتمل کتاب "حضرت خواجہ غلام فرید: حالات زندگی کشف و کرامات" میں بھی خواجہ فرید کے حالات و واقعات کو اہمیت دی گئی ہے۔

فریدیات کے موضوع سے متعلق محمد اسلم میتلا کی کتب "ذکرِ فرید"، "تذکارِ فرید"، "انوارِ فرید" اور "فرید نامہ" سرائیکی ادب میں اہم اضافہ ہیں۔ محمد اسلم میتلا کی تحریروں کی یہ خوبی ہے کہ چھوٹے چھوٹے مضامین کی شکل میں اہم اور بڑے بڑے موضوعات کو سادہ اسلوب سے متعارف کرانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ "ذکرِ فرید"، "تذکارِ فرید" اور "انوارِ فرید" سرائیکی زبان میں تحریر کردہ مضامین کے مجموعے ہیں جبکہ "فرید نامہ" میں اردو مضامین، کئی قلمی نسخوں کے عکس اور متعدد تصاویر و دستاویزی نمونے شامل کیے گئے ہیں۔

۱۹۹۱ء میں رحیم طلب کی کتاب "سخن فرید دا" سرائیکی ادبی مجلس بہاول پور کی پیش کش کے طور پر سامنے آئی جس میں کلامِ فرید کے کئی پہلو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۹۹۳ء میں عبدالعزیز اختر کی کتاب "عظیم صوفی شاعر: خواجہ غلام فرید" اور علامہ سعید احمد عباسی کی کتاب "تعلیمات تصوف حضرت خواجہ غلام فرید" میں تصوف کے موضوع کو اہمیت دی گئی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں ظفر اشاری کا تحقیقی مقالہ "خواجہ فرید دے تعلیمی نظریات" شائع ہو کر سامنے آیا جس میں توحید، رسالت، انسانیت، اطاعت، احترامِ معلم اور طریقہ تدریس جیسے اہم نظریات کو شامل تحقیق کیا گیا ہے۔

جمیلہ درانی کی کتاب "خواجہ غلام فرید: شخص و شاعر" ۱۹۹۶ء میں جام پور (راجن پور) سے شائع ہو کر سامنے آئی۔ اس کتاب میں تحقیقی انداز سے پیش کیے گئے موضوعات میں سے سرائیکی ادب میں خواجہ فرید کا مقام و مرتبہ، شہرت، شعری موضوعات اور ذاتی حالات شامل ہیں۔ اسی سال اردو اکیڈمی بہاول پور کی جانب سے خورشید ناظر کی کتاب "کلامِ فرید اور مغرب کے تنقیدی رویے" میں مغربی تنقیدی نظریات کی روشنی میں کلامِ فرید کا تجزیہ کیا گیا۔

فریدیات کے حوالے سے ۱۹۹۸ء کو خصوصی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ اس سال سو سالہ عرس کی تقریبات کے انعقاد کے ساتھ "فرید صدی" کے سلسلے کی کتب سامنے آنا شروع ہوئیں۔ عیسوی کیلنڈر کے مطابق ۲۰۰۱ء میں سو سال مکمل ہونے کے باعث فرید صدی کی تقریبات ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۱ء تک منانے کا اعلان ہوا تو اس دوران میں فریدیات کے موضوع کی سب سے زیادہ کتب کی اشاعت کا اہتمام بھی دیکھنے میں آیا۔ ان کتب میں ڈاکٹر شہزاد قیصر کی انگریزی کی کتاب بہ عنوان "Dimensions of Khawja Farid's Metaphysics" میں نظریہ وحدت الوجود کو عالمی سطح پر متعارف کرایا گیا۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "Metaphysicces of Khawaja Farid" اور فریدیات کے متعلق کتاب "Iqbal and Kahwaja Farid" بھی بیسویں صدی کے دوسرے برس شائع ہو گئیں۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کی اس کتاب کے علاوہ ایم اے کے تحقیقی مقالہ جات میں سے خورشید عالم کے مقالہ پر مشتمل کتاب "پاکستان میں مطالعہ فرید کی روایت"، ڈاکٹر روبینہ ترین کے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں شامل فریدیات کے حصہ پر مشتمل کتاب "خواجہ غلام فرید: شخصیت تے شاعری" اور ڈاکٹر محمد امین کی کتاب "خواجہ غلام فرید: فکر و فن" بھی سرائیکی ادبی بورڈ کی پیش کش کے طور پر سامنے آنے والی کتابوں کا حصہ ہیں۔ جھوک پبلشرز ملتان کی جانب سے شائع ہونے والی کتاب میں علامہ اعظم سعیدی کے سرائیکی مضامین کے مجموعے "روحِ فریدی" کے علاوہ محمد سعید احمد شیخ کی کتاب "اشارہ دلیں دے" سامنے آئی جس میں خواجہ غلام فرید کے کلام پر حسین بن منصور حلاج اور محی الدین ابن العربی کے اثرات کا فکری جائزہ شامل ہے۔ سعید احمد شیخ کی انگریزی کی کتاب "Khawaja Ghulam Farid (Poetry: A Brief Analysis" سرائیکی ادبی مجلس بہاول پور کی اشاعت کے طور پر سامنے آئی جس میں خواجہ فرید کے کلام کا تجزیہ مختلف موضوعات کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ چاچڑاں شریف سے حضرت مخدوم احمد میاں قریشی الکوریجہ کی تحریر کردہ کتاب "اسرارِ فرید" میں خواجہ غلام فرید اور ان کے خاندان کے متعلق

مختلف معلومات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا غلام جہانیاں کی کتاب "بلنت اقطاب" میں بھی خاندانِ فرید کے حوالے سے اہم معلومات شامل کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق کے انگریزی میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ۲۰۰۲ء میں "Vision of Khawaja Fareed: Past and Present" شائع ہوا۔ محمد سعید احمد شیخ کی کتاب "جہانِ فرید" بھی اسی سال منظرِ عام آئی جس میں کلامِ فرید میں شامل تصوف کے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح مجاہد جتوئی کی کتاب "اطوارِ فرید" اور "راہِ تحقیق سلکِ فریدی" میں اسی قسم کے موضوع کو زیرِ بحث لایا گیا۔ ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کی کتاب "فرید تے فریدیت" لاہور سے شائع ہوئی۔ ۲۰۰۶ء میں سامنے آنے والی اس کتاب کے حصہ اول "فرید" میں تعارف و مباحث اور حصہ دوم "فریدیت" میں فکرِ فرید کے حوالے سے شاعری کی تفہیم شامل ہے۔

ڈاکٹر طاہرہ تونسوی کی کتاب "مطالعہ فرید کے دس سال" لاہور سے شائع ہوئی جس میں بیسویں صدی کے آخری عشرے میں شائع ہونے والی فریدیات کے حوالے کی تحریروں کا توضیحی اشاریہ پیش کیا گیا۔ اس میں اس موضوع کی کتب کے علاوہ اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کی فہرست بھی شامل ہے۔ اسی سال شبیر حسن اختر کی کتاب "فرید شناسی" منظرِ عام پر آئی جس میں فرید شناسی، وحدت الوجود، فرید کی نظریاتی اساس، نظریہ عشق، نظریہ حسن، نظریہ الم، فرد فرید (شخصیت) اور معجزۂ فن جیسے موضوعات شامل ہیں۔ علاوہ ازیں محمد حیات چغتائی کی کتاب "خواجہ فرید تے سماجیات" خواجہ غلام فرید کے سماجی بندھن، معاشرتی ابلاغیات اور کلامِ فرید میں موجود جغرافیائی حوالے کے باعث منفرد نوعیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر طاہرہ تونسوی کی کتاب "خواجہ غلام فرید: شخصیت اور فن" اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ ۲۰۰۷ء میں سامنے آنے والی یہ کتاب اکادمی کے سلسلے "پاکستانی ادب کے معمار" کی ایک کڑی ہے۔ جس میں احوال و آثار کے علاوہ فنی اور فکری جائزہ شامل ہے۔ اس کتاب کے "پیش نامہ" میں افتخار عارف نے خواجہ غلام فرید کی شخصیت کے حوالے سے تحریر کیا ہے:

> "حضرت خواجہ غلام فریدؒ دنیائے شعر و ادب اور عرفان و سلوک میں یگانۂ روزگار تھے۔ برصغیر کے صوفیائے کرام میں ان کی شخصیت نمایاں ہے اور ان کے عقیدت مند اس پورے خطے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سرزمین پنجاب کو یہ شرف حاصل ہے

کہ یہ ان کی ذات سے مترشح ہونے والی روشنی کا مرکز ہے۔ حضرت خواجہ غلام فرید کے کلام میں اعلیٰ اخلاقی اقدار، قومی یکجہتی اور احترامِ آدمیت جیسے مضامین خاص اہمیت رکھتے ہیں۔" (۳)

محمد اعظم سعیدی کی کتاب "خواجہ غلام فرید: سائنسی پرکھ پڑچول" (۲۰۰۸ء) میں خواجہ فرید کی علوم پر عبور، زبانوں میں مہارت، ہوا اور بادل کے تعلق، تاریخ و جغرافیہ، ذہنی اور نفسیاتی سائنس جیسے موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا۔ حنیف چودھری کا اہم قلمی کا مقالہ "خواجہ غلام فرید کی سرائیکی کافیوں سندھی اور پنجابی لسانی اثرات" (۲۰۱۰ء) کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر ممتاز ظفر کی کتاب "آفاقی وسرمدی سرائیکی شاعر: خواجہ غلام فرید" (۲۰۱۵ء) کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس کے پہلے حصے میں خواجہ غلام فرید کی شخصیت اور فن اور دوسرے حصے میں فریدیات کے بارے میں لکھی گئی کتب پر تبصرے و تجزیے شامل ہیں۔ محبوب تابش کی تصنیف "انجمن مرلی" (۲۰۱۵ء) لاہور سے شائع ہوئی جس میں پائے جانے والے تحقیقی مضامین فریدیات کے اہم موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ کرنل محمد اقبال کی کتاب "کوٹ مٹھن دا مکھوٹ" خواجہ غلام فرید کی شخصیت اور فن کے حوالے سے لکھی گئی اور مجاہد انور بودلہ کی کتاب "خواجہ غلام فرید: احوال و آثار" (۲۰۲۰ء) میں حیاتِ فرید کے حوالے سے کئی گتھیاں سلجھانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ محمد سعید احمد شیخ کی کتب "جہانِ فرید" اور "فرید دروازہ" (۲۰۲۱ء) خواجہ غلام فرید کی شخصیت اور فن کے حوالے سے تحریر کی گئی اہم کتب میں شامل ہیں۔

خواجہ غلام فرید کی شخصیت اور فن کے حوالے سے جہاں متعدد مصنفین کی کتب شائع ہو کر سامنے آئی ہیں وہاں مرتبہ کتب کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مرتب کی گئی کتب میں سے ڈاکٹر طاہر تونسوی کی کتاب "عکسِ فرید" دو بار شائع ہو کر سامنے آ چکی ہے۔ جس میں اردو اور سرائیکی کے متعدد معروف قلمکاروں کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی سرپرستی میں شائع ہونے والے میگزین "مسلک" (گورنمنٹ ایجوکیشن کالج ملتان) اور گورنمنٹ ایس ای کالج بہاولپور کے میگزین "نخلستانِ ادب" کے خواجہ فرید نمبر کی اشاعت کسی مُرتبہ کتاب سے کم نہیں۔ مہر گل محمد کی مرتبہ کتاب "فکر فراقِ فریدی"، حمید الفت ملغانی (راقم) کی مرتب کی گئی کتاب "مسلک سلوکِ فریدی" اور عائزہ قریشی کی مرتب کردہ کتاب "تاثراتِ فرید" سرائیکی ادبی بورڈ ملتان کی پیش کش کے طور پر فرید صدی کی کتب کا حصہ ہیں جن میں سرائیکی کے منتخب قلم کاروں کی تحریروں کو ترتیب دیا گیا ہے۔ جاوید چانڈیو نے

فریدیات کے حوالے سے تین کتب مرتب کی ہیں۔ اکیسویں صدی کے شروع میں شائع ہونے والی ان کتابوں میں ''ارمغان خواجہ فرید''، ''اللہ میلے دل سنگ یارا'' اور ''مقالات خواجہ فرید سیمینار ۹۸'' شامل ہیں۔ جن میں سے دوسری اور تیسری کتاب اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں پڑھے جانے والے مقالات پر مشتمل ہیں۔ شعبہ سرائیکی بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات کو ڈاکٹر انوار احمد کی ادارت میں ڈاکٹر روبینہ ترین اور اجمل مہار، ابن اکبر نے مرتب کیا جس میں اردو، سرائیکی اور انگریزی تحریریں شامل ہیں۔ محمد حیات چغتائی کی مرتب کردہ کتاب ''نذر فرید'' میں مختلف شعرا کے منظوم خراج عقیدت کو شامل کیا گیا۔ جب کہ کرنل محمد اقبال کی کتاب ''خواجہ غلام فرید'' اور ''فرید و چاچڑ'' کو بھی مرتبہ کتب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مرتبہ مضامین میں سے احمد ندیم قاسمی کی تحریر سے ایک اقتباس پیش ہے:

> ''خواجہ فرید کے کلام کی یہ خصوصیت حیرت انگیز اور بے مثال ہے کہ اس شاعری کی عظمتیں اور اس کی رسائیاں کسی صورت میں محدود نہیں ہیں۔ خواص کے لیے یہ خاص شاعری ہے اور عوام کے لیے لوک شاعری ہے۔ یہ جو ان علاقوں کا کسان بھی ہل چلاتے ہوئے خواجہ فرید کی کافیاں گنگناتا ہے اور یہ جو یہاں کے بچوں سے لے کر جوان اور بوڑھوں تک اور بیٹیوں سے لے کر بیویوں اور ماؤں تک کے ہاں روزمرہ کی گفتگو میں بھی خواجہ صاحب کی کسی کافی کا کوئی بول ضرور دہرایا جاتا ہے اور ان کافیوں کے بے شمار مصرعے ضرب الامثال کے طور پر استعمال ہوتے ہیں تو یہ خواجہ فرید کی شاعری کی ہمہ گیری کے سوا کیا ہے۔ دنیا بھر کی زبانوں کی خانقاہی شاعری میں شاید ہی کسی شاعر کو وہ عقیدت، وہ عزت اور وہ محبت حاصل ہوئی ہو جو کہ خواجہ فرید کو حاصل رہی ہے، حاصل ہے اور ہمیشہ ابدالآباد تک حاصل رہے گی۔''(۳)

۲۔ کلام فرید: تدوین و ترجمہ

کلام فرید کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کلام کے متعدد قلمی نسخے پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں محقق اپنے اپنے طور پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ان نسخہ جات میں نسخہ

CamScanner

عداد یہ نسخہ ابابیہ نسخہ فقیر یہ نسخہ برخوردار یہ نسخہ مقتدمیہ نسخہ پیر یہ اور نسخہ جیلانیہ خاص طور پر معروف ہیں

فریدیات کے حوالے سے "دیوان فرید" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس دیوان میں سرائیکی کی معروف صنف "کافی" شامل ہے اور بیشتر کافیاں خواجہ غلام فرید کی زندگی کے دوران ۱۸۸۲ء میں "معدن عشق" کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ آپ کی وفات کے ایک سال بعد ۱۹۰۲ء میں "اسرار فریدی" کے عنوان سے خواجہ غلام فرید کا کلام شائع کیا گیا۔ بعد میں مختلف اشاعتی ادارے اس کلام کو اپنے اپنے طور پر شائع کرتے رہے۔ آخر کار ۱۹۴۴ء میں مولوی عزیز الرحمن کی ترتیب و ترجمے کے ساتھ "دیوان فرید" شائع ہوا۔ ردیف وار ترتیب دی گئی ان کافیوں کی تعداد ۲۷۱ ہے۔ بعد ازاں مختلف دیوان ترتیب و ترجمے سے شائع ہوئے لیکن سب نے مولوی عزیز الرحمن کے مرتب کردہ دیوان ہی کو بنیاد بنایا۔ بزم ثقافت ملتان کی جانب سے کیفی جام پوری اور ریاض انور کا مرتب کردہ اور ترجمہ شدہ "کلام فرید" اور مولانا نور احمد خان فریدی کے ترجمہ و ترتیب سے سامنے آنے والا دو جلدوں پر مشتمل "دیوان فرید" قارئین کی توجہ کا مرکز رہے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے "پیام فرید" کے عنوان سے خواجہ فرید کی کافیوں کو موضوع کی نسبت سے ترتیب دیا اور ترجمہ کیا تو ایک کافی ایسی بھی سامنے آئی جو ردیف کے معمولی فرق کے باعث دو بار شامل کی گئی ہے تو انہوں نے کافیوں کی تعداد ۲۷۱ مقرر کر دی۔ اس کے بعد سامنے آنے والے دیوان ۲۷۱ کافیوں پر ہی مشتمل ہیں۔ خواجہ غلام فرید کے کلام کو ترجمہ کرنے کا اعزاز آپ کے خاندان کے خواجہ طاہر محمود کوریجہ کو بھی حاصل ہوا۔ اس "دیوان فرید" میں ۲۷۱ کافیاں ردیف وار شامل کی گئی ہیں۔ خواجہ طاہر محمود کوریجہ کا اردو ترجمہ اسلوب انفرادیت کا حامل ہے۔ ہر فریدیات مجاہد جتوئی کی تدوین و ترجمہ سے سامنے آنے والے "دیوان فرید با تحقیق" کی انفرادیت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے مجاہد جتوئی کی تصحیح تدوین کے حوالے سے چند تحفظات کی بازگشت بھی سنائی دی۔ اس کے باوجود متعدد اداروں کی جانب سے اس دیوان کو شائع کیا جا چکا ہے۔ اس دیوان کے بارے میں سامنے آنے والے تحفظات کے حوالے سے اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کے علاوہ فریدہ ساجد لغاری کی کتاب "جائزہ دیوان فرید با تحقیق کا تنقیدی تحقیقی محاکمہ" شامل ہے۔

جاوید چانڈیو کا مرتب کردہ "دیوان فرید" اس لیے الگ پہچان کا حامل ہے کہ اس دیوان میں مولوی عزیز الرحمن کے ترتیب دیے متن کا "اسرار فریدی" سے تقابلی مطالعہ مع حواشی شامل کیا گیا۔ صدیق طاہر کے ترتیب دیے گئے "کلام خواجہ فرید" میں سرائیکی کلام کے علاوہ سندھی، فارسی اور اردو

شاعری کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ مہر حسان الحیدری کی ترتیب اور حواشی سے سامنے آنے والا "دیوانِ فرید اردو" اپنی نوعیت کی منفرد پہچان رکھتا ہے۔ واصف جبین کا ایم فل اردو کا مقالہ "تدوینِ کلامِ فرید اردو" کتابی شکل میں سامنے آیا جس میں شامل 110 غزلیات میں سے اولین غزل کا مقطع کچھ یوں ہے:

فرید اب افتتاح دفترِ دیوان کی کیجیے
کہ تو دیوانے بن جاویں ہزاروں تیرے دیوان سے (۵)

ڈاکٹر محمد بشیر انور اوہروی ملتانی کی جانب سے "صدائے خلیل جاناں" کے عنوان سے خواجہ غلام فرید کا فارسی کلام مع اردو ترجمہ پیش کیا گیا۔

خواجہ غلام فرید کے کلام کی مقبولیت کے پیشِ نظر مختلف اداروں یا مرتبین کی جانب سے اس کلام کو ترجمہ کے بغیر شائع کرنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ترجمے کے بغیر سامنے آنے والے "دیوانِ فرید" میں سے محمد یار گڑھی شریف، اخلاق بک ڈپو ملتان، عزیز المطابع بہاول پور، کتب خانہ حاجی نیاز احمد ملتان، دفتر منظور سیرانی اویسی ملتان، جھوک پبلشرز ملتان (مرتبہ: قیس فریدی)، اردو اکیڈمی بہاول پور (مرتبہ: دلشاد کلانچوی) اور یوسف منان لاہور (کلامِ خواجہ غلام فرید) خاص طور پر شامل ہیں۔ محمد اسلم میتلا کی تحقیق و تدوین سے کتاب "محرمِ رازِ دلبرے" میں خواجہ فرید کے ڈوہڑے اور مرجبہ کافیوں کے علاوہ ۹ حریبہ کافیاں پیش کی گئیں۔ خواجہ غلام فرید کے اردو کلام کے حوالے سے دیکھا جائے تو صدیق طاہر (دیوانِ فرید اردو) مسعود اشعر صدیقی اور ارشاد احمد امین (شعری مجموعہ خواجہ فرید اردو) اور کرنل محمد اقبال (خواجہ فرید کا اردو دیوان) کی ترتیب و اشاعت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

مولانا اللہ بخش ازہری نے عربی میں اور فرید بخش نے فارسی میں کلامِ فرید کی شرح لکھی۔ جن کے مخطوطے کی شکل میں موجود ہونے کا پتہ چلا ہے۔

محمد آصف خان نے "آکھیا خواجہ فرید نے" محمد افضل نے "کہیت خواجہ فرید" شفقت تنویر مرزا نے "کلیاتِ فرید" اور حمید اللہ ہاشمی نے "کلامِ خواجہ غلام فرید" کے عنوانات دیے جب کہ حنیف چودھری کی مرتب کی گئی کتاب "کافیاں خواجہ غلام فرید" منتخب کلام کو گورمکھی رسم الخط سے شاہ مکھی رسم الخط میں بدلنے کی ایک کوشش ہے۔

خواجہ غلام فرید کے مکمل دیوان کی ترتیب و تراجم کے علاوہ جزوی تراجم کی کتب بھی شائع ہو کر سامنے آتی رہی ہیں جن میں منظوم تراجم بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ کشفی ملتانی کا سرائیکی سے اردو منظوم

ترجمہ ''نقشِ صحرا''۔ نور الزمان احمد اوج کا منظوم اردو ترجمہ ''نقشِ صحرا''، بشیر احمد   بے تاب کا منتخب کافیوں کا منظوم ترجمہ ''ذکرِ فرید''۔ امداد نظامی نے منتخب سرائیکی کافیوں کو ''فرید رنگ فرید انگ'' کے عنوان سے منظوم اردو ترجمے کے طور پر پیش کیا۔ نور الزمان احمد اوج اور امداد نظامی کے تراجم نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

نور الزمان احمد اوج نے کافی کے بول ''نام اللہ دے پاندھیڑا۔ میڈا لے سنیہڑا جا'' کا ترجمہ کچھ یوں کیا:

اے جانے والے راہی اتنا کرم تو فرما
میرے حبیب تک یہ میرا پیام لے جا۔(۶)

امداد نظامی ''پُر دشت مجنوں روی۔ ہے دل دیوانی موہی'' کے منظوم اردو ترجمہ میں لکھتے ہیں:

دل دیوانہ اِک صحرائے وحشت میں کھو بیٹھے
اک اجڑے سے بیاباں میں قرار اپنا لٹا بیٹھے (۷)

الطاف گوہر اور شان الحق حقی کی ادارت میں ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی کی جانب سے اگست ۱۹۵۶ء میں شائع ہونے والی کتاب ''خیابانِ پاک'' میں پاکستانی زبانوں کے اہم شعرا کے کلام کے منظوم تراجم شامل کیے گئے ہیں۔ ان تراجم میں خواجہ غلام فرید کی کافیوں میں قیس چغتائی نے تین کافیاں، جمیل نقوی نے بھی تین کافیاں اور شباب رفعت نے ایک کافی کا منظوم اردو ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔
جمیل نقوی کے تراجم میں سے کافی ''رتھ سوار'' کے اختتامی اشعار کچھ یوں ہیں:

رستہ مشکل دل میں تمنا   جا پہنچوں منزل تک جلدی
میں اور یار ''فرید'' بسائیں   پھر جا کر ''مصنور'' کی نگری (۸)

اکادمی ادبیات پاکستان کی اشاعت کے حوالے سے سعید درانی اور راشد حسین کی مرتبہ کتاب ''پاکستان کے صوفی شعرا'' میں شامل خواجہ غلام فرید کی سرائیکی کافیوں کا منظوم ترجمہ ارشد ملتانی نے کیا ہے۔ شوکت مغل کی کتاب ''تفہیمِ فرید'' میں منتخب کافیوں کی تشریح شامل ہے۔ جبکہ خالد اقبال کی مرتب کردہ کتاب ''بھاگ سہاگ فرید'' میں شامل منتخب کافیوں کی تشریح متعدد قلم کاروں نے کی ہے۔
دلشاد کلانچوی کی کتاب ''فریدی کافیاں'' میں ایم اے سرائیکی کے نصاب میں شامل ہیں کافیوں کو ترجمہ

اور تشریح کے ساتھ پیش کیا گیا۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق نے خواجہ غلام فرید کے کلام کے مشکل الفاظ کا اردو ترجمہ "لغات فریدی" کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کیا۔ "کلیہ فرید" کے عنوان سے سامنے آنے والی دو جلدوں پر مشتمل کتاب علامہ طالوت۔ کے خاندان میں۔ سے ابو محمد منظور بن عبدالحمید آفاقی کی کاوش ہے جس میں الفاظ کے معانی کے علاوہ مرتب کیے گئے کلام میں سے مختلف مصرعوں کی اصلاح خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں محمد اکرم قریشی کی کتاب "اوزان دیوان فرید" میں فن عروض کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

ڈاکٹر کرسٹوفر شیکل کی کتاب "Fifty poems of Khawaja Farid" "خواجہ فرید کی پچاس کافیوں کے انگریزی ترجمہ پر مشتمل ہے۔ عامر حفیظ ملک کی مرتب کردہ کتاب "Selected Kafies of Khawaja Farid" میں رؤف لوتھر، کرسٹوفر شیکل، شہزاد قیصر، عرش صدیقی، فاروق نوید، سلمان قریشی، نذیر علی شاہ، اسلم انصاری، جیلانی کامران، عبدالرشید غوری اور محمد سعید شیخ کے سرائیکی سے انگریزی تراجم شامل ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں ریاض قدیر نے خواجہ غلام فرید کا مکمل سرائیکی کلام منظوم انگریزی ترجمے کے طور پر پیش کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ ۲۰۰۷ء میں پروفیسر سعید احمد خان نے خواجہ فرید کی منتخب کافیوں کو انگریزی میں منتقل کیا۔ خواجہ فرید کے سرائیکی کلام کے انگریزی ترجمے کے حوالے سے عبدالرؤف لوتھر کی کتاب "Khawaja Farid's Love Laden Lyrics" میں ۱۹۶ کافیوں کا انتخاب شامل ہے۔ بزم ثقافت ملتان کی اشاعت کے طور پر سامنے آنے والی کتاب "فرید پرکوبتا" میں خواجہ فرید کی منتخب کافیاں بنگالی زبان میں کیے گئے ترجمہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ یہ بنگالی ترجمہ کوی شمس الرحمٰن نے کیا ہے۔

خواجہ غلام فرید کی شعری تخلیقات کے علاوہ نثری سرمایہ بھی موجود ہے جو زیادہ تر فارسی زبان میں ہے۔ اس وقت فارسی دفتری زبان کی حیثیت حاصل ہونے کے باعث خواجہ فرید عموماً فارسی ہی میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ ویسے تو ان کے خطوط بھی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں لیکن خواجہ فرید کی دو کتب "فوائد فریدیہ" اور "اشارات فریدی" کی اہمیت مسلمہ ہے۔ "فوائد فریدیہ" مذہبی حوالے کی ایسی کتاب ہے جس میں مختلف دینی مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔ یعنی اس تصنیف کو خالصتاً عقائد اور تصوف کی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ "فوائد فریدیہ" کا سرائیکی ترجمہ میر حسان الحیدری چانڈیو نے "فتوحات فریدیہ" کے عنوان سے کیا۔ جسے سرائیکی ادبی مجلس بہاولپور کی اشاعت کے طور پر سامنے لایا

گیا۔ "اشارات فریدی" مولوی رکن الدین کی مرتب کردہ ایسی کتاب ہے جس میں خواجہ غلام فرید کی حیات کے آخری دس برس میں سامنے آنے والے ملفوظات کا تجزیہ یک جا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل یہ ملفوظات مولوی رکن الدین پرہاروی کی محنت کا ثمر ہیں جن میں سے تین جلدیں خواجہ غلام فرید کی وفات کے ایک برس بعد شائع ہو گئی تھیں جب کہ چوتھی جلد چالیس برس بعد سامنے آئی۔ اور پانچویں جلد اب تک قلمی شکل میں موجود ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے "فرمودات فرید" کے عنوان سے ملفوظات کا انتخاب شائع کیا۔ اور اسی انتخاب کا انگریزی ترجمہ عامر حلیلہ ملک کی پیش کش کے طور پر سامنے آیا۔ خواجہ غلام فرید سے منسوب تالیف "مناقب محبوبیہ" کا ترجمہ مجاہد جتوئی نے "حیات المحبوب" کے عنوان سے پیش کیا۔ یہ تالیف خواجہ غلام فرید کے والد بزرگوار خواجہ خدا بخش محبوب الٰہی کے بارے میں لکھی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حسان الحمید رتی چانڈیو، میر، فوائد فریدیہ سے فتوحات فریدیہ تک، مشمولہ "فتوحات فریدیہ" (فوائد فریدیہ کا سرائیکی ترجمہ)، از خواجہ غلام فرید، مترجم: میر حسان الحمید رتی چانڈیو، بہاولپور: سرائیکی ادبی مجلس، ۱۹۹۸، ۲۰۰۷ء، ص ۲۹

۲۔ مسعود حسن شہاب، خواجہ غلام فرید، بہاولپور: اردو اکادمی، ۱۹۶۳ء، ص ۳۲

۳۔ افتخار عارف، پیش نامہ، مشمولہ "خواجہ غلام فرید: شخصیت اور فن"، از ڈاکٹر طاہر تونسوی، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۷

۴۔ احمد ندیم قاسمی، خواجہ فرید، مشمولہ "عکس فرید"، ترتیب و تہذیب: ڈاکٹر طاہر تونسوی، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۱۹۹۹ء، ص ۵۹

۵۔ واصف جیمی، تدوین کلام فرید اردو، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۵۲

۶۔ نور الزمان احمد اوج (مترجم)، "روہی رنگ۔ خواجہ غلام فرید کی کافیوں کا منظوم ترجمہ"، بہاولپور: اردو اکیڈمی، ۱۹۸۰ء، ۵۱

۷۔ اسد اکلائی (مترجم)، "فرید رنگ فرید انگ: تذکرہ، تبصرہ اور منظوم تراجم"، کوئٹہ: جدران پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۵

۸۔ شکیل لغاری (مترجم)، کلام فرید، مشمولہ "خیابان پاک"، کراچی: ادارہ مطبوعات پاکستان، ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۹

تاریخ و ثقافت

سرائیکی وسیب کی تاریخ و ثقافت کو اجاگر کرنے والی تحریروں میں جہاں برطانوی عہد کے گزٹیئرز کو اہمیت حاصل ہے وہاں سید محمد لطیف کی کتاب "Early History of Mollan"، منشی حکم چند کی کتب "تواریخ مولتان" اور "تواریخ ضلع ڈیرہ غازی خان"، سید اولاد علی گیلانی کی کتاب "مرقع مولتان"، ابر ملتانی اور پاکشن بترہ کی کتاب "تواریخ ملتان" ورلالہ ہتورام کی کتاب "گل بہار" (بہ حوالہ ڈیرہ غازی خان کے بلوچ قبائل کی تاریخ و ثقافت) کا شمار بھی ابتدائی طور پر سامنے آنے والی کتب میں ہوتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد شائع ہونے والی کتب میں بہاول پور کی تاریخ پر مبنی نذیر علی شاہ کی کتاب "صادق نامہ" (۱۹۵۹ء)، شمس الدین عاصی گیلانی کی تصنیف "ارمغان اوچ" (۱۹۶۶ء)، ارشد حسین ارشد کی کتاب "ملتان قدیم و جدید" (۱۹۶۸ء)، اکرام الحق شیخ کی تحریر "ارض ملتان" (۱۹۷۲ء)، مولانا نور احمد خان فریدی کی دو جلدوں پر مشتمل "تاریخ ملتان" (۱۹۷۳ء)، عتیق فکری کی کتاب "نقش ملتان" کی دو جلدیں اور منشی عبد الرحمٰن کی کتابیں "آئینہ ملتان" اور "تاریخ ملتان ذیشان" کو اس خطے کی تاریخ کو نمایاں کرنے والی کتب تصور کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مہر عبد الحق کی کتاب "ملتان کے بادشاہ، نامور گورنر اور حملہ آور"، محمد اسلم میتلا کی کتاب "ملتان نامہ"، شبیر حسن اختر کی تصنیف "ملتان اردو کی جنم بھومی"، ڈاکٹر روبینہ ترین کی تحقیق "ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ"، عمر کمال خان کی تحریر "ملتان ایک دور میں"، ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کی کتاب "ملتانی: ملتان کی تاریخ و ثقافت"، حفیظ خان کی تحریر "آثار ملتان: ملتان سدا آباد"، سید زاہد علی واسطی کی کتاب "دیکھیا ملتان"، محمد داؤد طاہر کی کتاب "ارمغان ملتان"، نوید شہزاد کی کتاب "ضلع ملتان: تاریخ تے ادب"، محمود شاکر حسین شاکر کی کتاب "ملتان: عکس تحریر"، "ملتان کی قدامت اور وادی سندھ میں" خصوصی اہمیت کے پیش نظر لکھی جانے والی کتابوں میں سے نمونے کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

روہی کے خطے کی ترجمانی کے حوالے سے دیکھا جائے تو صدیق طاہر کی کتاب "وادیٔ ہاکڑہ

اور اس کے آدرز"، احمد غزالی کی تالیف "چولستان"، دلشاد کلانچوی کی کتاب "ضلع بہاول پور: تاریخ تے ادب"، سید علی واسطی کی کتاب "بہاولپور کی سرزمین"، سید عارف محسن بلے کی مرتب کتاب "روہی کے خدوخال"، زبیر شفیع غوری کی کتاب "اوچ شریف: تاریخ، ثقافت، آثار قدامت و عظمت"، محمد سلیم خان نیازی کی کتاب "روہی سکھ"، جام فیاض مہاندکی کتاب "ڈکھ سمندر ول دریا"، علامہ دین محمد عباسی کی تحریر "جدید تاریخ اوچ شریف"، مزاہد محمود خاکوانی کی تالیف "ریاست بہاول پور: مختصر جغرافیہ و تاریخ"، مجاہد حسین کی کتاب "بہاول پور: خوشحال ریاست سے پسماندہ ڈویژن تک"، حلیم شہزاد کی تحریر "تاریخ ضلع بہاول نگر: معدوم سے معلوم تک"، جاوید عثمان شامی کی کتاب "چولستان کی تاریخ و ثقافت" اور ذوالقرنین نقوی کی تصنیف "چولستان: تاریخ کے آئینے میں" جیسی کتابیں اہم کردار کی حامل ہیں۔

تھل کی تاریخ و تہذیب کو نمایاں کرنے والی کتابوں میں ڈاکٹر مہر عبدالحق کی کتاب "تھل"، محمد اکرم میرانی کی تحقیق "گریٹر تھل"، ڈاکٹر مزمل حسین کی کاوش "تھل دا لوک ادب"، نور محمد تھند کی کتب "تاریخ لیہ" اور "تاریخ بھکر"، سجاد حیدر پرویز کی کتاب "ضلع مظفر گڑھ: تاریخ ثقافت تے ادب"، ملک دوست محمد کھوکھر کی تصنیف "تاریخ ریاست منکیرہ"، ڈاکٹر لیاقت علی نیازی کی مرتب کتب "میانوالی: تاریخ و تہذیب" اور "لیہ: تاریخ و ثقافت"، ملک تیمر محمد بھٹہ کی کتاب "جدید تاریخ مظفر گڑھ" اور خدا بخش ناصر (ناصر ملک) کی کتب "انسائیکلو پیڈیا لیہ"، "لیہ کی تاریخ" اور حنیف سیماب کی کتاب "از خاک دین پناہ" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

دامان کا خطہ کوہ سلیمان اور دریائے سندھ کے درمیان میں واقع ہے۔ اس علاقے کی تاریخی و تہذیبی اہمیت کو اجاگر کرنے والی کتابوں میں غلام علی ہکانی کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب "مرقع ڈیرہ غازی خان"، عبدالقادر لغاری کی "تاریخ ڈیرہ غازی خان" کی دو جلدیں، ہاشم شیر خان کی کتابیں "علامہ اقبال اور ڈیرہ غازی خان" اور "ڈیرہ غازی خان کے تہذیبی خدوخال"، احسان چنگوانی کی "تاریخ ڈیرہ غازی خان" حصہ اول و حصہ دوم، مظہر علی خان لاشاری کی کتاب "ڈیرہ غازی خان: تاریخ کے آئینے میں"، سید حفیظ اللہ کی کاوش "اپنا ڈیرہ اسماعیل خان: تاریخ کے آئینے میں"، امین اللہ خان گنڈا پور کی کتاب "تاریخ سرزمین گومل"، غلام عباس سیال کی کتاب بہ حوالہ ڈیرہ اسماعیل خان "ڈیرہ نکھ سرائیکستان"، یوسف جام پوری کی کتابیں "تذکرہ اہل جنود شہر جام پور" اور "سیر بین منظر راجن پور اور اے نزد شہر جام پور"، ملک منظور احمد بھٹہ کی تالیف "تونسہ کا منظر نامہ" اور پروفیسر محمد خان ملغانی کی کتاب "لو

ک دی تونسہ شریف" کے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔

ابن حنیف کی کتابیں "سات دریاؤں کی سرزمین" اور "جنوبی پنجاب کے آثار قدیمہ"، محمد اسلم رسول پوری کی کاوش "سرائیکی قومی سوال"، محمد اکرم میرانی کی کتاب "سرائیکی وسیب"، جمیل احمد دھریجہ کی کتاب "سرائیکی وسیب"، ملک سعید احمد کی کتاب "سرائیکی وسیب"، ڈاکٹر شکیل پتافی کی کاوش "تہذیبی خدوخال"، مجیب بخش کی کتاب "سرائیکی قومی تفاخر: ایک تاریخ"، قیس تسیح ایراوی کی کتاب "سرائیکی تاریخ تہذیب ثقافت و جغرافیہ" اور یاسر جواد کی کتاب "سرائیکی وسیب کی تاریخ" پورے وسیب کی نمائندگی کرتی ہیں۔

جمشید احمد کمتر احمدانی کی کتابیں "پاندھی کر داخل"، "تاریخ احمدانی"، "وطن آیا تو میں ڈاتیں"، "شجرہ احمدانی تاریخ وستی" اور "سرائیکی جھاں ساگے"، سجاد حیدر پرویز کی تصنیف "وسیب اساڈا پاکستان"، اختر حسین خان کی تالیف "پاکستان ساڈی سنجان"، حمید الفت ملغانی (راقم) کی کتاب "دھرتی قائد محابہ"، عبدالباسط بھٹی کی تحریر "زیر البدا پچے"، مظفر خان گمی کی کاوش "قومی لوادی دے چہرہ"، آصف جا چھتری کی کتاب "تو مردی ما" (فاطمہ جناح) اور قاسم سیال کی کتاب "ڈتی دھرتی دی" (بے نظیر بھٹو) سرائیکی زبان میں تحریر کی گئی ایسی کتابیں ہیں جو تاریخ کے مختلف موضوعات کو زیر بحث لاتی ہیں۔

سرائیکی لوک ادب کو محفوظ کرنے کے سلسلے میں سامنے آنے والی کتابوں میں ڈاکٹر مہر عبدالحق کی کتاب "سرائیکی لوک گیت" میں جہاں منتخب لوک گیت شامل ہیں وہاں ان لوک گیتوں کی اہمیت، قدامت اور اقسام کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ حمید الفت ملغانی (راقم) کی کتاب "سرائیکی لوک ریت" پیدائش سے وفات تک کی رسومات کا احاطہ کرتی ہے۔ ملک عبداللہ عرفان کی کتاب "ناتھ جی" سرائیکی لوک ورثہ کی ایسی داستان ہے جس میں خطے کے قدیم شہروں کی زبان، ثقافت کو محفوظ کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ علاوہ ازیں ملک عبداللہ عرفان کی کتاب "سرائیکی لوک قصے" میں چار اہم قصے شامل ہیں۔ طاہر حقی کے قصے "یک بیا بادشاہ"، ایم بی اشرف کے قصے "اللہ آپ بادشاہ"، سجاد حیدر پرویز کی کتاب "قصہ قصولی"، حافظ محمد فیاض تانگی کی مرتب کتاب "قصہ گیا جھرکوں"، عصمت اللہ شاہ کے مرتب کردہ "سوجھل قصے" اور شوکت مغل کی کتابیں "وسیبی قصے" اور "سرائیکی وسیب دیاں لوک کہانیاں" لوک ادب کی اہم مثالیں ہیں۔ ظفر لاشاری کی کتاب "سرائیکی سہرے"، اسلم رسول پوری کی کتاب "سرائیکی لوک موسیقی"، طارق اسماعیل احمدانی کی کتاب "سرائیکی لوک بیانیہ"، ملک آصف سیال کی دو کتابیں "میڈی

بجلی وار ہووے" اور "عشق ہے خدا دا" مقدسیہ قاسم کی کتاب "سرائیکی لوریاں" اور عاصمہ ظہور کی کتاب "شادی دے سہرے" لوک ادب کے بارے میں ہونے والی تحقیق و تدوین کی نمائندگی کرتی ہیں۔

استاد فدا حسین گاڈی کی کتاب "سرائیکی کلچر"، جاوید احسن خان کی کاوش "سرائیکی ثقافت"، شوکت مغل کی تحریر "سر ذاتر کہ"، اقبال حسن بھپلا کی "سجھ"، جمیل احمد دھریجہ کی تالیف "سرائیکی اجرک"، خالد اقبال کی تحریر کردہ کتاب "سرائیکی سماج تے میڈیا"، ڈاکٹر گل عباس اعوان کی کتاب "سرائیکی ثقافت دے رنگ"، ہزار خان کی ثقافتی کہانیاں "پانی دال کہانی"، ڈاکٹر عبدالجبار جوئیہ کی تحریر "صوفیانہ موسیقی"، محمد عارف کی تحقیق پر مبنی "ملتان میں موسیقی کی روایت" اور پروفیسر خالد پرویز کی کتاب "ملتانی دستکاریاں" سرائیکی ثقافت کے مختلف رنگوں کو واضح کرنے والی اہم کتب شمار ہوتی ہیں۔

محبوب تابش کی کتاب "سرائیکی قومی تناظر: ایک تاریخ" میں سرائیکی وسیب کی عہد بہ عہد تاریخی، تہذیبی، جغرافیائی اور قومی و لسانی حقیقت کو واضح کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ یاسر جواد کی کتاب "سرائیکی وسیب کی تاریخ" میں ملتان، بہاولپور اور ڈیرہ غازی خان ڈویژن کے علاوہ سرگودھا اور ڈیرہ اسماعیل خان ڈویژن کے بعض اضلاع بھی شامل کیے گئے ہیں۔

ادبی تحقیق اور تنقید

سرائیکی نثری ادب میں تحقیق و تنقید کا موضوع قیام پاکستان کے بعد خصوصی توجہ کا مرکز بنا۔ ابتدائی طور پر محمد بشیر احمد ظامی بہاول پوری کی کتاب "پھر کے" کو سرائیکی تنقیدی و تحقیقی مضامین کا باقاعدہ مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں شائع ہونے والی اس کتاب میں سرائیکی زبان و ادب کے بارے میں تجزیاتی مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کے مطابق "ایز احمد ایاز اویسی کا اردو زبان میں سرائیکی شخصیات کا تذکرہ 'نخلف' ۱۹۶۶ء میں سرائیکی اکادمی صادق آباد نے کتابی شکل میں شائع کیا "(۱)۔ صادق بشیر کی تالیف 'رت رنگیاں ججھاں' ۱۹۶۷ء میں سامنے آئی۔ تذکرہ نگاری کی اس کتاب کے بعد ممتاز ڈاہر اور محمد نواز ذاتی الی آبادی کی ترتیب و تہذیب سے آنے والی کتاب "واہندے نیر" اور نسیم سرمدی کی کتاب "دامان" اور "ناکھاں" کے علاوہ بعض متعدد قلم کاروں کی کتب تذکرہ نگاری سے تعلق رکھتی ہیں۔

سرائیکی شعری ادب کے مطالعہ کے لیے ۱۹۶۹ء میں شائع ہونے والی کتاب " سرائیکی شاعری" حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ جب کہ پنجاب یونی ورسٹی لاہور کی جانب سے شائع ہونے والی "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" ادبی تاریخ میں مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں شائع ہونے والی اس ادبی تاریخ کی چودھویں جلد میں میر حسان الحیدری کی تحریر "سرائیکی ادب" شامل ہے۔ جس سے سرائیکی ادب کے ابتدائی نقوش واضح ہوتے ہیں۔

میر حسان الحیدری اپنی تحریر کا آغاز سرائیکی زبان کے خطہ کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "مغربی پاکستان (صوبہ جات پنجاب اور سرحد کا وہ علاقہ جس کے شمال مغرب اور مغرب میں کوہ سلیمان اور جنوب میں سندھ واقع ہے اور جسے مشرق میں جہلم اور چناب پنجابی زبان کے علاقے سے علیحدہ کرتے ہیں، سرائیکی یا ملتانی زبان کا خطہ کہلاتا ہے۔"(۲)

Mir Zaheer Abass Rustmani

CS CamScanner

تحقیق و تنقید کے ابتدائی نقوش کے بعد جن قلم کاروں نے اس موضوع کی نسبت سے سرائیکی ادب میں نام پیدا کیا۔ ان نامور قلم کاروں میں ڈاکٹر مہر عبدالحق کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے جہاں تحقیق و تنقید کے حوالے سے لسانیات، فریدیات اور تاریخ و ثقافت کے موضوعات پر قلم اٹھایا وہاں ان کی تحقیق و تدوین سے سامنے آنے والی کتاب "نورِ جمال" میں حافظ جمال ملتانی کے احوال و آثار کی تلاش و جستجو اور شعری تحقیق "چوہ نامہ" کی ترتیب و تدوین کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

دلشاد کلانچوی کی متعدد کتب تحقیق و تنقید کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کتب میں "سرائیکی اور اس کی نثر"، "سرائیکی زبان تے ادب"، "ادبی چول چچول"، "تنقیدی ونڑ ہاں"، "قدیم سرائیکی شاعر تے ادیب"، "چار سرائیکی صوفی شاعر"، "سرائیکی ادب دی چنگیر"، "سرائیکی ورثہ و بیواراں"، "سرائیکی شاعری دے کجھ مہاندرے شاعر" اور "خواجہ غلام الدین سیرانی تے انہاں دی سی حرفی ہیر" کے عنوانات ان کے موضوعات کی بھی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر کرسٹوفر شیکل کی کتاب انگریزی کی تحقیق "اے سروے آف سرائیکی سٹڈیز ان انگلش" کو "سرائیکی مطالعے: ڈے سو سال" کے عنوان سے سرائیکی قالب میں ڈھالنے کا فریضہ بھی دلشاد کلانچوی کی کاوش میں شامل ہے۔

ڈاکٹر طاہرہ تونسوی کا نام اردو ادب کے ساتھ ساتھ سرائیکی ادب میں بھی خاصا معروف ہے۔ سرائیکی ادب میں ان کی پہلی تحقیقی کاوش "خیر شاہ دا کلام" میں خیر شاہ کے حالات زندگی کے علاوہ سرائیکی کلام میں دوہڑہ اور کافی کی اصناف شامل ہیں۔ اس سلسلے کی دیگر کتب "چراغ اعوان دی ہیر"، "خوشدل" اور "کلام شاکر" (شاکر تونسوی) کے کلام کی تلاش اور احوال و آثار کی جستجو کا فریضہ بھی ڈاکٹر طاہرہ تونسوی کے حصے میں آیا۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے سامنے آنے والی ان کی کتاب "سرائیکی کتابیات" میں آغاز تا ۱۹۹۳ء کی کتابوں کے اندراجات شامل ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے منعقد ہونے والی قومی کانفرنس ۱۹۹۳ء میں پڑھے جانے والے مقالے پر مبنی کتاب "سرائیکی وچ مزاحمتی شاعری" متعدد بار سامنے آ چکی ہے۔ ڈاکٹر طاہرہ تونسوی کی کتاب "سرائیکی ادب: ریت تے روایت" کا شمار معروف کتب میں ہوتا ہے جس میں سرائیکی ادب کی متعدد اصناف اور کئی اہل قلم کا تجزیاتی مطالعہ شامل ہے۔ "قائداعظم تے سرائیکی زبان و ادب" اور "علامہ اقبال تے سرائیکی زبان و ادب" میں سرائیکی قلم کاروں کی پاکستانیت سے خصوصی دلچسپی کا اظہار واضح کیا گیا ہے۔ ان کی کتاب "گل مہر

مست مجنوں کا پیامبر" در شاہ لطیف کے حوالے سے دو کتب "آئینہ خانہ شاہ لطیف" اور "لطیف شناسی"
سندھ کے سرائیکی ادب کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی کے اصل نام اور قلمی نام کے حوالے سے پروفیسر نواز صدیقی لکھتے ہیں:

> "یہ وہی حفیظ الرحمن ہے جس نے خود شناسی کی منازل طے کر کے طا
> ہر تونسوی کا روپ دھار لیا ہے لہٰذا موجودہ حال یہ ہے کہ حفیظ الرحمن کو تو بہت کم لو
> گ جانتے ہیں مگر طاہر تونسوی کا نام زبان زد خلائق عام ہے"۔ (۳)

محمد اسلم رسول پوری نے لسانیات کے علاوہ بھی تحقیق و تنقید پر خصوصی توجہ دی ہے۔ سرائیکی
زبان میں شاعری کرنے والے کلاسیکی شعرا "نگل سرمست"، "بیدل سندھی"، "حمل لغاری"، "عبد
اللطیف لطفن" اور "محمد ظریف خوشتر" کے احوال و کلام کی تلاش و جستجو کا فریضہ ادا کیا۔ تحقیق و تنقید کے مو
ضوع کی دیگر کتب میں "سرائیکی ادب وچ معنی دا پندھ"، "تلاوڑے"، "ہجوڑے" اور "نیکھے" تجزیاتی
مضامین کے اہم مجموعوں میں شامل ہیں۔ "سرائیکی دا مہاندرا شاعر: طلعت محمود"، "مارکسی نقطۂ نظر تے
ساڈا ادب" اور "سرائیکی تنقید تے مابعد نوآبادیاتی نظریہ" جیسے عنوانات بھی تحقیق و تنقید کی نمائندگی کرتے
نظر آتے ہیں۔

شوکت مغل کل وقتی محقق کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ لسانی تحقیق کی باریکیوں پر گہری نظر
رکھنے کے علاوہ تحقیق و تنقید کے دیگر موضوعات کو بھی شامل تحریر کرتے رہے۔ تحقیق و تنقید کے حوالے
سے ان کی دو کتب "ملتانی وادراں" اور "کھوتے کنوا" کو اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے خواجہ فرید
ایوارڈ حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ علاوہ ازیں "کتائی"، "جھمیر" اور "بکڑا" کے عنوانات سے
سامنے آنے والی کتابیں تحقیقی و تنقیدی مضامین کے حوالے سے سامنے آئی ہیں۔ "کتاب دی گال
کتاب دے نال" میں کتاب دوستی اور کتاب دشمنی کے حوالے سے ان کے ذاتی تجربات کا تجزیہ شامل
ہے۔ اردو میں تحریر کی گئی کتب "دلشاد کلانچوی: شخصیت اور فن" اور "اقوات" کو بھی سرائیکی ادبی موضو
عات کی توضیحات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ شوکت مغل کی کتاب "مرزا صاحباں" کو متنی تدوین کی اہم
مثال کہہ سکتے ہیں جس میں رچرڈ ٹمپل کے رومن متن کو سرائیکی متن میں پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔
یہ متن دراصل داستان گو شاعر "بیلو" کی تحریر ہے جسے رچرڈ ٹمپل کی کتاب "دی لیجنڈ آف پنجاب" کا حصہ
بنایا گیا۔ شوکت مغل اپنی تصنیفات کے مقدمات لکھنے پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان

کے ان مقدمات کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر مقبول گیلانی نے اردو اور سرائیکی کتابوں کے مقدمے جمع کر کے "مقدمات" کے عنوان سے کتاب شائع کر دی جب کہ عمار شاہ نے ان کے انگریزی کتب کے دیباچے "Prefaces" کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کیا۔

ڈاکٹر قصر اللہ خان ناصر کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "سرائیکی شاعری دا ارتقا" دو بار شائع ہو کر سامنے آ چکا۔ جب کہ ان کی کتب "نویں سوچ" اور "معتوبیت" میں شامل تحقیقی و تنقیدی مضامین سرائیکی ادبی دنیا میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کا نام سرائیکی ادب کی تاریخ کے حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے ان کی پہلی کتاب "سرائیکی ادبی تاریخ" ۱۹۸۴ء میں سامنے آئی۔ اسی سال ماہنامہ سرائیکی ادب کا اشاریہ بعنوان "سرائیکی ادب دے تیرھاں سال" بھی کتابی شکل میں شائع ہوا۔ "سرائیکی ادبی تاریخ" کی اشاعت کے دو برس بعد ۱۹۸۶ء میں "سرائیکی ادب دی مختصر تاریخ" منظر عام پر آئی۔ بعد ازاں "سرائیکی ادب: نور تے چندر" اور "سرائیکی ادب کی ابتدا تا ۱۹۷۰ء کا دور" کے عنوان سے آنے والی کتب نے بھی ادبی تاریخ کی مزید ترجمانی کی۔ جب کہ اکیسویں صدی کے آغاز میں مقتدرہ قومی زبان کی جانب سے "سرائیکی زبان و ادب کی مختصر تاریخ" کی اشاعت عمل میں آئی۔ بعد ازاں اس کتاب میں ترمیم و اضافے کے بعد اسی کتاب کو "مختصر تاریخ زبان و ادب: سرائیکی" کے عنوان سے متعدد بار شائع کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کی تحقیق و تنقید کے موضوع کے حوالے سے دیگر کتب بھی شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں "ڈائریکٹری سرائیکی مصنفین" میں ۵۷۲ لکھاریوں کے کوائف شامل ہیں۔ ایم فل کے مقالہ پر مبنی "اردو اور سرائیکی کے باہم تراجم" دو بار شائع ہو کر سامنے آئی اور کتاب "پرکھ پڑچول" میں ادبی تنقید اور تنقیدی نظریات زیر بحث لائے گئے۔ ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کی شخصیت اور فن کے بارے میں سامنے آنے والی کتب میں نواز جاوید کی تحریر "سجاد حیدر پرویز بطور افسانہ نگار" اور قاسم جلال کی کاوش "سجاد حیدر پرویز بطور شاعر" شامل ہیں۔

حفیظ خان کا نام سرائیکی تخلیقات کے علاوہ تحقیق و تنقید میں بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ "خرم بہاولپوری: شخصیت، فن، منتخب سرائیکی کلام"، "رفعت عباس کی سرائیکی شاعری" اور "پٹھانے خان: گائیکی اور شخصیت" سرائیکی شعر و ثقافت کے حوالے سے جانی جانے والی شخصیات کے بارے میں اہم تحقیقی کتب ہیں۔ جبکہ "سرائیکی ادب: افکار و جہات" اور "ڈھیر جہاں واقف" تحقیق و تنقید کے متعدد مو

موضوعات کو سامنے لانے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اسی طرح کتاب ''وادیٔ سندھ کی شعوری تاریخ: کافی'' میں سرائیکی کی معروف صنف ''کافی'' کی قدامت و اہمیت واضح کی گئی ہے۔ حفیظ خان کے بارے میں عصمت اللہ شاہ کی مرتب کردہ کتاب ''حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں'' میں اردو اور سرائیکی کے متعدد قلم کاروں کی تحریروں کو جمع کیا گیا ہے۔ ماہنامہ ''بک ڈائجسٹ'' لاہور کا ''محمد حفیظ خان نمبر'' بھی متعدد اہل قلم کی تحقیقی، تنقیدی کاوشوں کا ثبوت ہے۔

حمید الفت ملغانی (راقم) کی کتابوں میں ''جانباز عہد ساز انسان ہے'' معروف شاعر جانباز جتوئی کی شخصیت اور فن کے متعلق ہے۔ جب کہ اسی موضوع کی مناسبت سے آنے والی کتاب ''جانباز جتوئی: فن و شخصیت'' اکادمی ادبیات پاکستان کے سلسلے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کی ایک کڑی ہے۔ ''طاہر تونسوی: فن و شخصیت'' بشریٰ ناہید کے اشتراک کے ساتھ شائع ہونے والی ایسی کتاب ہے جس کا پہلا حصہ بشریٰ ناہید کے ایم اے اردو کے مقالے پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ حمید الفت ملغانی (راقم) کی کاوش ہے۔ ''پاکستانی زبانوں کا ادب'' میں دیگر پاکستانی زبانوں کے ساتھ ساتھ سرائیکی ادب بھی شامل ہے۔ دو کتب ''لکھت تے لکھاری'' اور ''لکھت دیوا'' میں سرائیکی اصناف، ادبی شخصیات اور دیگر موضوعات کے حوالے سے سرائیکی ادبی مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ ''ادب کہانی'' کے عنوان سے سامنے آنے والی کتاب میں ۱۹۹۳ء تا ۲۰۰۷ء کے حوالے سے کتابی شکل میں شائع ہونے والے سارے ادبی جائزے یک جا کرنے کے علاوہ موضوع وار شامل کیے گئے ہیں۔ ''کتابیات سرائیکی ادب'' میں پانچ ہزار سے زیادہ سرائیکی کتب کی فہرست پیش کی گئی ہے یہ کتاب مصنف وار ہے نیز عنوان وار اور موضوع وار اشاریہ بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔ ''سرائیکی افسانوی ادب'' میں سرائیکی ادب کی تین اہم نثری اصناف: ناول، افسانہ اور ڈراما کا تجزیاتی مطالعہ شامل ہے۔

ڈاکٹر نسیم اختر کی تحقیقی و تنقیدی کتب میں حاجی پور (راجن پور) سے تعلق رکھنے والے شاعر میاں اللہ بخش عارض اور گڑھی اختیار خان (رحیم یار خان) کے اہم شاعر احمد یار فریدی کا منتخب کلام ''دیوان عارض مع ڈوہڑہ جات احمد یار فریدی''، بیکل سرمست کی شاعری بہ عنوان ''بیکل سرمست سرائیکی کلام''، قدیم شاعر قبول فقیر اقبال کی تدوین ''وفات نامہ حضرت اسماعیل'' اور تدوین کے حوالے سے ''دیوان ولایت شاہ بخاری'' کے علاوہ ''سرائیکی افسانے وچ خواتین دے مسائل'' جیسی دستاویزات شامل ہیں۔

ڈاکٹر ظفر مہدی کی کتاب "سرائیکی مرثیہ: حضرت شمس تبریز تا گل محمد عاشق ملتانی"، نقش پیر اصحابی کی تحقیق "سرائیکی ادب وچ مرثیہ"، ڈاکٹر اسلم انصاری کی کاوش "سرائیکی ناول نگاری"، قدسیہ قاسم کی کتاب "سرائیکی افسانے وافی ویہرا"، تین جلدوں پر مشتمل فیض بلوچ کی کتاب "سرائیکی شاعری اچ غزل گوئی"، مہر قیصرانی کی کتاب "سرائیکی تاریخی داراں" (جلد اول)، عبدالجبار جونیجو کی کتاب "کافیاں"، حمید قریشی کی کاوش "سرائیکی غزل"، عبدالباسط بھٹی کی تحریر "احمد پور دی سرائیکی غزل" اور مرید عارف کی کتاب "سرائیکی مرثیے وچ تحز" سرائیکی زبان کی مختلف اصناف نظم و نثر کے حوالے سے تحقیق و تنقید پر مبنی ہیں۔ اسی طرح محبوب تابش کے مقالہ پر مبنی کتاب "نظموں کے درمیان" جدید اردو سرائیکی نظم کے تقابلی جائزے کی نمائندگی کرتی ہے۔

ڈاکٹر جاوید چانڈیو کی کتاب "سرائیکی زبان وادب اور معاشرہ"، محمد ممتاز خان کی تحریر "جدید سرائیکی شاعری تے اجوکا بندہ"، ڈاکٹر مقبول گیلانی کی کتب "سرائیکی زبان وادب: ایک تاریخی جائزہ" اور "نروار"، حفیظ الرحمن خان کی کتاب "سرائیکی نقد وادب"، علامہ اعظم سعیدی کی کتاب "وادی ہاکڑہ وچ صحافت"، ڈاکٹر مزمل حسین کی کتابیں "بلاغت دا فن تے سرائیکی ادب" اور "اجوکی سرائیکی تنقید"، ڈاکٹر گل عباس اعوان کی کتب "سرائیکی شاعری وچ انسان دوستی" اور "جدید سرائیکی شاعری"، محمد صدیق ملک کی کتاب "سرائیکی ادب میں پاکستانیت"، شہزادہ اسد انصاری کی تحقیق "سرائیکی لوک قصیاں دے کردار"، عبدالجبار جونیجو کی کتاب "سرائیکی شاعری: ہک مطالعہ" اور جاوید آصف کی تحقیق "سرائیکی صحافت" جیسی کتب کو تحقیق و تنقید کے منتخب موضوعات کے مطالعے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

ارشاد تونسوی کی تحریر "عشق اساڈا دین"، ڈاکٹر شکیل پتافی کی کاوش "سرائیکی ادبی مقالات"، صدیق طاہر کی کتاب "دیوے"، ڈاکٹر قاسم جلال کی کتابیں "گول پھرول" اور "الا"، نواز کاوش کی کاوش "تزکیہ"، جسارت خیالی کی کتاب "سرائیکی اہل قلم کی تحقیقی، تنقیدی اور شعری خدمات"، مرید عارف کی تحریر "کھرے اکھر"، عمران میر کی کتاب "کت" اور فیض بلوچ کی کتاب "سانجھ سلوک" مختلف موضوعات کے تحقیقی، تنقیدی مضامین پر مشتمل ہیں۔ محبوب تابش کی کتاب "نظموں کے درمیان" میں جدید اردو اور سرائیکی نظم کا تقابلی جائزہ شامل ہے۔ مجاہد جتوئی کی تحقیق و ترجمہ کے حوالے سے سامنے آنے والی کتاب "سیفل نامہ با تحقیق" تحقیق کے موضوع کی نمائندگی کرتی ہے۔

سیٹھ محمد عبدالرحمان کی کتب بہ عنوان "سرائیکی کتابیات" اور "سرائیکی کتابیں"، طلش پیر

CamScanner

اصحابی کی تحقیق" سرائیکی ادب وچ مرثیہ" (کتابیات)، جاوید فاروق بھٹہ کا تیار کردہ "قصر فرید لائبریری کوٹ مٹھن میں موجود نادر قلمی اور مطبوعہ کتب کا اشاریہ"، اجمل مہار ابن اکبر کی کتاب" سرائیکی ریسرچ سنٹر میں قلمی نسخہ جات" شبیر حسن اختر، مجید شبیر اور نسیم اختر کی ترتیب و تہذیب" گوشہ تحقیق فکری، جو شیکی شماریہ" اور اکادمی ادبیات پاکستان سے ۱۹۹۰ تا ۲۰۰۸ء شائع ہونے والی سالانہ" کتابیات پاکستانی ادب" میں شامل" سرائیکی کتابیات" کو تحقیقی میدان میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد کی تلاش و جستجو سے گیارہویں صدی عیسوی کے شاعر عبدالرحمان کے قدیم سرائیکی کلام" سندیس راسک" کی اشاعت، قدامہ ھمدانی کی کاوش" جانباز جتوئی" ظفر لاشاری کی کتاب " جانباز جتوئی: حیاتی تے فن"، ڈاکٹر اسلم رانا کی تحریر" کچل سرمست: احوال، آثار تے سرائیکی کلام دا معروضی تجزیہ"، عطا محمد عطا کے تحقیقی مقالہ پر مبنی کتاب" بابائے سرائیکی: ڈاکٹر مہر عبدالحق"، محمد بشیر بلوچ کی ترتیب و تہذیب سے سامنے آنے والی محمد حسین شاد کی شعری تخلیق" ہیت دی ہک"، ہاشم شیر خان کی تدوین" دیوان عاقل جتوئی"، رحیم طلب کی کتاب" آکھیا مبارک شاہ نے"، ڈاکٹر بشیر انور لاہوری کی کاوش" کلام کامن ملتانی"، دلبر مولائی کی تحریر" یادگار اکرم"، فریدہ ساجد غفاری کی کتاب" اکرم قریشی: شخصیت و فن"، جسارت خیالی کی تحریر" اقبال سوکڑی: شخصیت و فن"، سید مالک اشتر کی کتاب" سرور کربلائی فن تے شخصیت"، جمشید اقبال کی تحقیق" سرائیکی وسیب دا مہاندرا انصاری: ڈاکٹر سید قاسم جلال"، مظفر عباس اور مجیب تابش کی مرتبہ کتاب" سوہنا سئیں آں" بحوالہ صابر چشتی جیسی کتابیں انفرادی شخصیات کے حوالے سے ہونے والی تحقیق و تنقید میں شمار ہوتی ہیں۔ اسی طرح ندیم بخاری اور واثق گیلانی کی تدوین کردہ جھنگ کے سات شعرا کے حوالے سے کتاب" کچل"، دلبر حسین مولائی کی تین جلدوں پر مشتمل کتاب" وسیبی سخنور" پاکستان سے ہندوستان ہجرت کر جانے والے قلم کاروں کے حوالے سے تنویر شاہد محمد زئی کی تحقیقی کاوش" ہمی ہجرت لکھتی ہے" سرائیکی وسیب کے منتخب اہل قلم کے بارے میں پروفیسر نواز صدیقی کی کتاب" ڈکھرے چتر وسیب دے" اور جسارت خیالی کی کاوش" تذکرہ شعرائے تونسہ شریف" کو اجتماعی شخصیات کے حوالے سے سامنے آنے والی کتب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ دلنور نور پوری اور دیگر مرتبین کی ترتیب سے پیش کی جانے والی منتخب شاعری میں شعرا کا مختصر تعارف بھی شامل رہا ہے۔

ڈاکٹر قاضی عبدالرحمن عابد، خالد اقبال اور الطاف خان ڈاہر کی کاوش سے سامنے آنے والی کتاب" تحقیق، مسائل تے حل" اور خالد اقبال و عبدالباسط بھٹی کے تراجم کے حوالے سے شائع ہونے والی کتاب"

تنقیدی مضامین "نصابی ضرورت" کے باعث پیش کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں بزمِ اکرم قریشی ماہنامہ افق (ڈیرہ غازی خان) کی جانب سے متعدد شعری تخلیقات کے حوالے سے تنقیدی جائزے کا ایک سلسلہ کتابچوں کی شکل میں بھی جاری رہا جسے سرائیکی ادبی دنیا میں پذیرائی حاصل رہی۔

حوالہ جات

۱۔ سجاد حیدر پرویز، ڈاکٹر، "مختصر تاریخِ زبان و ادب: سرائیکی"، اسلام آباد: ادارہ فروغِ قومی زبان، طبع چہارم، ۲۰۱۶ء، ص ۳۸۴

۲۔ حسان الحیدری، ایم، سرائیکی ادب، مشمولہ "تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند"، چودھویں جلد، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء، ص ۴۵۷

۳۔ محمد نواز صدیقی، پروفیسر، "دکھڑے بیتڑ بیت دے"، ملتان: جھوک پبلشرز، ۲۰۰۲ء، ص ۹

متفرقات

CamScanner

بچوں کا ادب

ڈاکٹر طاہر تونسوی ۱۹۸۸ء میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

> "اس وقت پاکستان کی علاقائی زبانوں میں اور خاص طور پر ان زبانوں میں جو تدریس کی زبانیں نہیں ہیں، انفرادی طور پر یہ کوشش کرنا ہوگی کہ بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی ادب تخلیق کیا جائے اور انہیں زبان کو پڑھنے کی طرف راغب کیا جائے۔ سرائیکی کو بھی بہت بڑا مسئلہ درپیش ہے۔ اس مسئلہ کا حل اس وقت ممکن ہے جب ہم اشاعتی سرگرمیوں کو تیز کر کے کتابوں کے انبار لگا دیں۔ جہاں تک سرائیکی میں بچوں کے ادب کی بات ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہر لکھنے والے کا یہ فرض ہے کہ وہ بچوں کے لیے بھی لکھے اور اس صنف میں لکھے جس میں بڑوں کے لیے لکھ رہا ہے۔"(۱)

اس اقتباس کے پیش نظر دیکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں سرائیکی زبان و ادب کے بارے میں ڈھیروں کتب سامنے آئی ہیں۔ جن میں سے بچوں کے ادب سے متعلق بھی متعدد کتب شامل ہیں۔ سرائیکی زبان میں شائع ہونے والی کتب کا اندازہ اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے "کتابیات پاکستانی ادب" کے نام سے سالانہ شائع ہونے والی سعیدہ درانی کی مرتبہ کتاب سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں قومی زبان اردو کے علاوہ پاکستانی زبانوں میں سے سرائیکی کتب کی تعداد سب سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔

سرائیکی میں بچوں کے ادب کے آغاز و ارتقا پر نظر دوڑائی جائے تو اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ سرائیکی ادب میں لوک ادب کی روایت بہت پرانی ہے لیکن جہاں تک سرائیکی ادب کے اشاعتی مراحل سے گزر کر سامنے آنے کا تعلق ہے تو یہ بات بالکل عیاں ہے کہ دیگر پاکستانی زبانوں کی طرح سرائیکی زبان کا ادبی سرمایہ بھی زیادہ تر قیام پاکستان کے بعد اشاعت کے مراحل طے کر کے سامنے آیا یہاں تک کہ لوک ادب کے حوالے سے چھپنے والا ڈھیروں مواد بھی اسی دوران چھپائی کے مراحل سے

CamScanner

گزرا۔ لوک ادب میں قصہ کہانی کی روایت بہت پرانی ہے۔ لوک قصہ، نثری اور شعری دونوں صورتوں میں موجود رہا ہے اور متواتر ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہوئے ان قصوں میں وقت کے ساتھ ساتھ رد و بدل بھی ہوتا رہا ہے۔ ان میں سے بچوں کے ذوق کو جلا بخشنے والے قصوں میں بادشاہوں اور شہزادوں کے علاوہ دیو، جن اور پریوں کے قصے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دراصل بچوں کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ حقیقت کی بجائے حیرت کی جانب زیادہ راغب ہوتے ہیں نیز دلچسپی اور تعجب کی فضا برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ بچوں میں مہم جوئی کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ کچھ کہانیوں میں اخلاقی اور اصلاحی پہلو افسانے کے پیرائے میں بیان کرنے سے بچوں کی اصلاح کی شعوری کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح کہانیوں میں موجود چٹکلے بھی بچوں کی دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں۔ ان کہانیوں کی بدولت ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر ثقافت و معاشرت کے متعدد نقوش دیکھے جا سکتے ہیں جو بچوں میں معاشرتی زندگی کا شعور پیدا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

سرائیکی زبان میں موجود لوک قصے بھی روہی، تھل اور دامان کی معاشرت و ثقافت کے امین ہیں۔ ان قصوں کو ضائع ہونے سے بچانے کی غرض سے جو کتب سامنے آئی ہیں ان میں سے محمد اشرف بزدار کی کتاب "سرائیکی لوک قصے" میں دیگر علاقوں کے ساتھ ساتھ "دامان" کی ثقافت خاص طور پر نمایاں ہے۔ "سرائیکی لوک قصے" ہی کے نام سے ملک عبداللہ عرفان کی شائع ہونے والی کتاب میں زبان کی چاشنی بچوں کے ساتھ بڑوں کی دلچسپی کا باعث بھی ہے۔ محمد بشیر احمد ظامی بہاولپوری کی ترتیب دی ہوئی کتاب "سرائیکی لوک کہانیاں" میں شامل کہانیوں کو تین حصوں یعنی بچپن کا دور، لڑکپن کا دور اور جوانی کا دور میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں "روہی" کی ثقافت کے عناصر واضح ہیں اور اسی طرح محمد طاہر غنی کی کتاب "ہک بادشاہ" میں ملتان اور مضافات کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔ احمد غزالی کی اردو زبان میں شائع شدہ کتاب "چولستانی لوک کہانیاں" میں جہاں چولستان کی لوک کہانیوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں شعری صورتوں میں موجود کچھ لوک قصوں کو اردو کے بجائے سرائیکی زبان ہی میں شامل کیا گیا ہے۔

شوکت مغل کی کتب "الف ب بتوا"، "آئی مائی" اور "ساڈا ترکہ" میں بچوں کی نظمیں، پہیلیاں، لوک دعائیں اور لوک کہانیاں دلچسپ اور منفرد انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ جمشید کمتر رسولپوری نے اپنی کتاب "لوک سمل" اور "سرائیکی ساڈی سنجان" میں بچوں کی کھیلوں کے طور اطوار کے علاوہ

بچوں کے متعلق لوک قصے بھی شامل کیے ہیں۔ جاوید احسن خان کی کتاب "سرائیکی ثقافت" میں بھی بچوں کی کھیلیں، لوک قصے اور لوک گیت پائے جاتے ہیں۔ ابن کلیم احسن نظامی کی کتاب "مٹھل پٹ" اور سجاد حیدر پرویز کی کتاب "قصہ قصولی" میں پائے جانے والے لوک قصے بڑوں اور بچوں میں یکساں مقبول ہیں۔

جہاں تک لوک شاعری کا تعلق ہے تو اس میں بچوں کے لوک گیت، لوریاں، کھیلوں کے بول اور منظوم قصے قابل ذکر ہیں۔ یہ شاعری عموماً ہلکے پھلکے اور شوخ انداز میں ہوتی ہے۔ جس سے بچے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ اسے با آسانی یاد بھی کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق کی کتاب "سرائیکی لوک گیت" کی ابتدا لوریوں اور بچوں کے گیتوں سے ہوتی ہے۔ اسی طرح حمید الفت ملغانی کی کتاب "سرائیکی لوک ریت" میں بھی لوریاں موجود ہیں۔

سرائیکی لوک ادب میں کہانیوں اور شاعری کے علاوہ پہیلیوں کی اہمیت بھی مسلمہ ہے۔ پہیلیاں بچوں میں بہت زیادہ مقبول ہوتی ہیں کیونکہ یہ یاد کرنے میں آسان ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کی ذہنی آزمائش کی تکمیل کرتی ہیں۔ حسنین قیصرانی کی کتاب "سرائیکی بجھارتاں" اور باقو بلوچ کی ترتیب و پیش کش "منجھ میڈی بجھارت" بچوں کے ادب میں خوبصورت اضافہ ہیں۔

بچوں کی ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں دی جانے کی روایت صدیوں پرانی ہے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اپنی کتاب "سرائیکی دیاں مزید لسانی تحقیقاں" میں معروف سرائیکی کتاب "نصاب ضروری" کو اس حوالے کی اولین کتاب کہا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اس کتاب کے مصنف مولوی خدا بخش صاحب موکڑ تحصیل تونسہ ضلع ڈیرہ غازی کے رہنے والے تھے اور انہوں نے یہ کتاب ۱۲۷۹ ہجری میں تحریر کی۔ اس کتاب کی مقبولیت کے بارے میں ڈاکٹر مہر عبدالحق رقم طراز ہیں:

> "یہ کتاب اتنی مقبول رہی ہے کہ وادی سندھ کے بالائی نصف حصے میں کوئی
> مدرسی ادارہ ایسا نہ تھا جہاں یہ کتاب ضروری نصاب کے طور پر نہ پڑھائی جاتی
> ہو۔ بلکہ گھروں میں عورتیں بھی اپنے بچوں کو زبانی یاد کراتی تھیں۔"(۲)

اسی طرح ابتدائی تعلیم کے لیے قاعدہ کی اہمیت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ویسے تو سرائیکی زبان کے شائع ہونے والے معروف قاعدے لکھنے والوں میں دلشاد کلانچوی، قاضی راضی، نظامی بہاولپوری، نور احمد سیال، اسلم رسولپوری، اختر وحید، سید نذیر علی شاہ، دادی گبول، ناصر فریدی، سجاد حیدر پرویز، خلیل

احمد شودا، معین الدین پیرزادہ، مشتاق حسین کاظمی، عبداللطیف بھٹی، بگٹی رسول پوری کے علاوہ نیو لائف
سوسائٹی رحیم یار خان، جمعیت الانصار دین پور اور خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ کے نام لیے جا سکتے ہیں
لیکن گزشتہ چند سالوں سے شوکت مغل کا مرتب کردہ "سرائیکی قاعدہ" بہت زیادہ مقبول ہوا ہے۔ جس
کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ سرائیکی قاعدوں میں اردو کے مروج حروف تہجی کے علاوہ سرائیکی
زبان کے پانچ اضافی حروف (ٻ، ڄ، ݙ، ڳ، ݨ) شامل ہیں۔ قاعدہ سے ایک قدم آگے بڑھ کر پہلی
جماعت کے بچوں کے لیے ابن قیصر نے "سرائیکی کی پہلی کتاب" مرتب کی جبکہ راہی گبول اور ناصر
فریدی کی مشترکہ کوششوں سے "سرائیکی دی پہلی کتاب" "سرائیکی دی ڈوجھی کتاب" اور "سرائیکی کی
ترجمی کتاب" بھی شائع ہو کر سامنے آئی ہے۔ خیبر پختونخوا ٹیکسٹ بک بورڈ کی جانب سے جماعت
اول سے جماعت پنجم کی کتب کی اشاعت کا عمل بھی مکمل ہو چکا ہے۔ پنجاب میں ابتدائی تعلیم میں
سرائیکی زبان کی عدم موجودگی کے باعث یہ زبان بولنے والے بچوں کی اکثریت سرائیکی لکھنے اور پڑھنے
سے نابلد ہے۔ سید نذیر علی شاہ کی کتاب "سرائیکی بول چال" اور ظامی بہاولپوری کی کتاب "سرائیکی اردو
بول چال" اس کمی کو پورا کرنے کی مختصر کوششیں کہی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح سرائیکی گرامر کو سمجھنے کے لیے
ظامی بہاولپوری کی کتاب "گلستان قواعد" گرانقدر سرمایہ سے کم نہیں ہے۔

ادب کسی بھی زبان کا ہو اس میں بچوں کے متعلق شاعری اپنے اسلوب اور انداز تحریر سے
بچوں کی دلچسپی کا باعث بنتی ہیں۔ یہ شاعری عموماً بچوں کی نفسیاتی دلچسپی کو مدنظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ بیشک لو
ک ادب میں بھی بچوں کے متعلق ڈھیروں نظمیں موجود ہیں لیکن بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے
پیش نظر نئے اور منفرد موضوعات کی نظمیں بچوں کے ادب کا حصہ بنی ہیں۔ محمد بشیر احمد ظامی بہاولپوری
نے "ٹمکلاں دے ہار" کے عنوان سے بچوں کے متعلق شعری مجموعہ پیش کیا جس میں مذہبی، ملی، اصلاحی
اور تخلیقی نظمیں خاص طور پر شامل کی گئی ہیں۔ ابن کلیم احسن نظامی کی بچوں کی مختصر نظمیں "لولوی" کے
نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں چھوٹی چھوٹی نظموں کے علاوہ بچوں کی دلچسپی بڑھا
نے اور رنگ بھرنے کے لیے تصویری خاکے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ معروف لکھاری دلشاد کلانچوی نے
جہاں دیگر موضوعات پر بہت کچھ تحریر کیا وہاں بچوں کے ادب میں بھی ان کی خدمات گرانقدر ہیں۔ بچوں
کی شاعری کے حوالے سے "نویں سوجھلا" اور "نویں نسل" ان کی اہم کتب شمار ہوتی ہیں۔ جبکہ ان کے
شعری مجموعہ "الے بیلے بوں" اور "کلام کلانچوی" میں بھی بچوں کی نظمیں پائی جاتی ہیں۔ شاعری کے علا

وہ نثر میں بھی دلشاد کلانچوی نے بچوں کے متعلق بہت کچھ تحریر کیا ہے جن میں سے سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے دو کتابیں "جہاں رسول کریم ﷺ بال بن" اور "جہاں رسول کریم ﷺ بچگر بن" کے علاوہ اقبالیات کے موضوع پر "چیکاں بال اقبال" اور کہانیوں کا مجموعہ "ماسترئی تے منطوطا" خاص طور پر مشہور ہیں جبکہ ان کے سرائیکی مضامین کی کتاب "گل پھل" میں بھی بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق کچھ مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ محمد اسلم میتلا کے شعری مجموعہ "ڈکھ تجوک" اور "بیت الڑی" میں بچوں کی نظموں کے متعلق ایک ایک حصہ مختص کر دیا گیا ہے۔

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ بچوں کے ادب میں جو کچھ بھی تحریر کیا جاتا ہے اس میں حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے کہ بچوں کو زیادہ سے زیادہ تفریحی ادب مہیا کیا جائے۔ یہاں اس بات کا دھیان رکھنا ضروری ہے کہ اس میں جو تفریحی مواد پیش کیا جا رہا ہے وہ اس قسم کا ہو جس سے بچوں کے اطوار پر مثبت اثرات مرتب ہوں اور ان کی معلومات میں بھی اضافہ ممکن ہو۔ دیگر اصناف کے علاوہ بچوں کے لیے معلوماتی اور تفریحی ڈرامے بھی اس مقصد کو پورا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والے متعدد ڈراموں میں سے حفیظ خان کی کتاب "ماں جمال خاں" اور مقبول عباس کاشر کے نشر ہونے والے ڈراموں کی کتاب "چندر تارے" اور "چاچو الف خالی" اشاعت کے مراحل طے کر چکی ہیں۔ منظور اعوان کی کتاب "وڈے لوک وڈیاں گالھیں" میں بچوں کے لیے سبق آموز واقعات پیش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔

سنجیدہ تحریروں کے علاوہ مزاحیہ تحریریں بھی بچوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہوتی رہتی ہیں۔ ابن قیصر کی کتاب "ٹک گھوڑ" میں طنز و مزاح کے متعلق پائے جانے والے مضامین میں جہاں بڑوں کے لیے طنز کے نشتر موجود ہیں وہاں بچوں کے لیے مزاح کے عناصر بھی نمایاں ہیں۔ اسی طرح احسان اعوان کی مرتب کردہ لطائف کی کتاب "ڈھڈ دے پٹ" بچوں میں اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بانو بلوچ کے ترتیب دیئے گئے لطیفے "کھوٹ کھاروے لطیفے"، "مخولی سکار" اور "ڈاکٹریں دے لطیفے" کے علاوہ سجاد حیدر پرویز کی ترتیب سے "کھل اوے کا کھل" جیسی کتب بھی بچوں کے ادب کا حصہ ہیں۔

ایک وقت ملتان اور خان پور سے شائع ہونے والے روزنامہ "جھوک" میں بھی بچوں کے ادب کو شامل کیا جاتا ہے۔ جس میں چھوٹی چھوٹی نظمیں، کہانیاں اور مضامین خاص طور پر شامل ہوتے

ہیں۔ بچوں کے متعلق مخصوص ایڈیشن میں زیادہ تر بچوں کی تحریروں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ "چندر تارے" کے عنوان سے سہ ماہی رسالہ بھی شائع ہوتا رہا ہے جسے ظہور احمد دھریجہ اور محمد شاہد دھریجہ کی ادارت سے سامنے لایا جاتا رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ طاہرہ تونسوی، ڈاکٹر، سرائیکی میں بچوں کا ادب، مشمولہ: ماہنامہ "آہنگ"، مارچ ۱۹۸۸ء

۲۔ عبدالحق، ڈاکٹر مہر، سرائیکی دیاں حرف لسانی تحقیقاں، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ص ۲۷۳

نسائی ادب

پاکستانی زبانوں کے ادب کو جانچنے کے لیے اکادمی ادبیات پاکستان نے کتابیات پاکستانی ادب کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۹۰ء سے شروع کیا اور ۲۰۰۹ء تک سالانہ اشاعت کے تحت چھپنے والے انیس شمارے اس بات کے گواہ ہیں کہ ان انیس برس میں سرائیکی ادب کا پلہ بھاری رہا۔ سرائیکی ادب کی اس رفتار میں جہاں مرد قلمکار شامل رہے وہاں خواتین کی بھرپور نمائندگی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ خواتین بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ سرائیکی شاعری میں متعدد مجموعے اور افسانوی ادب میں زیادہ تر تحریریں صنف نازک سے تعلق رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی خواتین نے اپنا سکہ منوایا ہے۔

سرائیکی شعری روایت میں مخفی بی بی ملتانی کو خواجہ غلام فرید کے عہد کی اہم شاعرہ تصور کیا جاتا ہے۔ جن کی کتب تعلیم النساء، عشق حقانی اور مخفی اسرار کی اشاعت کا پتہ چلا ہے۔ ان میں سے مخفی اسرار کی اشاعت ۱۹۰۱ء میں عمل میں آئی۔ ۱۹۲۲ء میں قصبہ داجل (راجن پور) میں پیدا ہونے والی شاعرہ جنت آدر کریم کا نام سرائیکی ادب میں خاصا معروف ہے ان کا مجموعہ کلام "اکھ ملک ریداں" ان کی وفات کے بعد ۱۹۸۳ء میں شائع ہو کر سامنے آیا۔ جس میں نعت کا رنگ نمایاں ہے۔ اقبال بانو کی شعری تصنیف "دل جاگدا تکھے" خواتین کے سرائیکی کلام میں جدت لانے کی اہم مثال ہے۔

بہارالنساء بہار کی متعدد کتب اردو اور سرائیکی میں شائع ہو چکی ہیں۔ سرائیکی کتب میں "مچھل تل اکھیں" اولین تخلیق کے طور پر ۱۹۹۳ء میں سامنے آئی جس میں مختلف اصناف خصوصاً کافی، گیت، غزل اور نظم شامل ہیں۔ دوسری کتاب "سکھے خواب میڈے" ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی۔ جس میں خواتین کے مسائل بھی واضح کیے گئے۔ "مراد بس دلبر" کے عنوان سے چھپنے والی کتاب ملی نظموں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۹۹ء میں سامنے آنے والی اس کتاب میں سرائیکی کے علاوہ اردو کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔

سحر سیال کی کتاب "تراے دا شجر" ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ جس میں آزاد نظم کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ عورت کے دکھ درد سحر سیال کی شاعری کی خاص پہچان ہے۔ رضوانہ تبسم درانی کا شعری مجمو

ہ" چیچیاں چیچیاں وٹگ" ۱۹۹۸ء میں ڈیرہ غازی خان سے چھپ کر سامنے آیا۔ جس میں شاعرہ نے مرد کے معاشرے میں عورت کو بے بس و مجبور قرار دینے کے باوجود ناامیدی کی بجائے امید کی شمع کو روشن کیا ۔رضوانہ تبسم درانی کا دوسرا مجموعہ کلام "کونج چنا نبھ دی" کے عنوان سے ۲۰۰۸ء میں ملتان سے شائع ہوا۔ جس میں ان کی شاعری مزید نکھر کر سامنے آئی۔ ۲۰۱۸ء میں رضوانہ تبسم درانی کی تخلیق "بانبھ وچ بدھے گانے" سامنے آئی۔ جس میں "سرائیکو" کی صنف شامل ہے۔ ہر سرائیکو کے بعد اس کا اردو مفہوم بھی پیش کیا گیا ہے۔

صابرہ شاہین جنہیں شاہین ڈیروی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ شعر و ادب میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "خالی ہک" ۲۰۰۲ء میں سامنے آیا۔ اس کتاب میں پائی جانے والی شعری اصناف میں نظم، غزل، ڈوہڑہ، کافی اور گیت شامل ہیں۔ صابرہ شاہین کی شاعری میں معاشرے کی ہر عورت کے اندر کی آواز واضح طور پر نظر آتی ہے۔

صفیہ ملک کے دو شعری مجموعے سامنے آئے۔ ۲۰۰۹ء میں "ہنجوں دی مالا" اور ۲۰۱۲ء میں "جتیں تن لگدی" کے عنوان سے سامنے آنے والے مجموعوں میں ڈوہڑے کی صنف میں درد و الم اور معاشرے کی بے حسی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ عالیہ انصول کی دو کتابیں "آس دے ڈیوے" اور "ساون منگھو ملہار" بالترتیب ۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آئیں جن میں رجائیت کے پہلو واضح نظر آتے ہیں۔ عابدہ ملتانی اور شبنم شاکر کی شعری تصنیفات ملتان سے شائع ہونے کی بازگشت بھی سنی گئی ہے۔ اسی طرح عابدہ ناز کا مجموعہ کلام "محبت لکیں"، شبنم اعوان کا شعری مجموعہ "یوجھن" اور فضہ بی بی کی شاعری "لکھاں دی گلی" سے سرائیکی میں شائع ہونے والی سرائیکی شاعری کی روایت مضبوط ہوئی ہے۔

ان شعری مجموعہ جات کے علاوہ بھی متعدد شاعرات کا کلام اخبارات و رسائل کی زینت بنتا رہتا ہے یا معاشرہ میں پائے جانے والے گھٹن کے باعث کسی الماری، دراز یا پڑولی میں اس وقت تک قید ہے جب تک گھٹن کے آثار ختم نہیں ہو جاتے۔

وزیر آغا کی منتخب نظموں کو اردو سے سرائیکی ترجمہ کرانے کا خیال فرحت نواز کے ذہن میں آیا ۔جنہوں نے مختلف شعراء سے ترجمہ کرانے کے بعد ان نظموں کو "چونڑویاں نظماں" کے عنوان سے شائع کرایا تھا۔

سرائیکی نثر نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو افسانہ ایک ایسی صنف ہے جس میں خواتین

نے اپنے حقوق کی جنگ لڑی۔ خواتین کی سرائیکی تخلیقات میں افسانہ کی یہ انفرادیت بھی قابل فخر ہے کہ سرائیکی ادب میں سامنے آنے والا اولین افسانوی مجموعہ "اپنی دھرتی جھکا اسمان" ایک خاتون کا ہے جسے مسرت کلانچوی کے نام سے زمانہ جانتا ہے۔ علاوہ ازیں مسرت کلانچوی کے افسانوی مجموعے "ڈکھن کنیں دیاں واٹیں" اور "قفل ماروا چینڑا" بھی سرائیکی وسیب میں داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مسرت کلانچوی نے جہاں عورت کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے وہاں سرائیکی کے منتخب الفاظ اور افسانوں کے عنوانات کا انتخاب بھی منفرد انداز کا ہوتا ہے۔

بتول رحمانی کی کتاب "سانجھ" بہاول پور سے شائع ہوئی جس میں پائے جانے والے بیس افسانوں میں رومانوی رنگ بھی موجود ہے۔

بشریٰ قریشی کا افسانوی مجموعہ "پیت پریت" ڈیرہ غازی خان سے شائع ہوا۔ جسے اکادمی ادبیات پاکستان سے "خواجہ فرید ایوارڈ" ملنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس مجموعہ کے افسانوں میں سادہ اور آسان زبان کا استعمال کیا گیا ہے اور اکثر افسانوں کا انجام طربیہ ہے۔

بنت احمدانی سے ڈاکٹر غزالہ احمدانی تک کا سفر کرنے والی افسانہ نگار کے افسانے متعدد رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر غزالہ احمدانی کے افسانوں سے معاشرے کے متعدد روپ بے نقاب ہوئے۔ ان افسانوں میں علامت، ملامت اور مزاحمت کے حوالے خاص طور پر نظر آتے ہیں۔ روہی تھل اور دامان کے علاوہ سندھ کی ثقافت کا عکس بھی ان کے مشاہدات کا نچوڑ نظر آتا ہے۔

سرائیکی استاد طلعت نقوی کے افسانے "اکھڑی ڈھہ" کے عنوان سے سامنے آئے۔ نسائی ادب کے حوالے سے سامنے آنے والے اس مجموعے کو عورت کے مسائل عورت کے قلم سے پیش کرنے کی ایک منفرد کاوش کہا جا سکتا ہے۔

"ساہ ہویں نوں بیرا" کے عنوان سے راجہ خان کا افسانوی مجموعہ ملتان سے چھپ کر سامنے آیا۔ جس میں آسان اور خالص زبان میں لکھی جانے والی کہانیاں جہاں معاشرتی مسائل کی نشاندہی کرتی ہیں وہاں ان افسانوں کے عنوانات بھی وسیب سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مہر النساء قاطمہ کے افسانوں کا مجموعہ "جھاتی" کے عنوان سے سامنے آیا۔ زمانہ طالب علمی میں شائع ہونے والے یہ افسانے معاشرتی مسائل خصوصاً عورت کے حقوق کی ترجمانی کرتے ہیں جن میں افسانوں کے ساتھ ساتھ چند افسانچے بھی شامل ہیں۔

سرائیکی کے طبع زاد افسانوی مجموعوں کے علاوہ اردو کے بیس سے زائد افسانوں کے تراجم پر مشتمل کتاب "منزلاں تے پندھیڑے" فرحت نواز کی پیشکش ہے جسے ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔

افسانوں کی کتب کے علاوہ خواتین کے متعدد افسانے اخبارات و رسائل میں آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان افسانہ نگار خواتین میں سے ثمینہ اسیال کا نام خاص طور پر معروف ہے جن کا مجموعہ "آ ڈیکھ سنجو دازو وچ" بوجوہ شاعت کے مراحل طے نہیں کر سکا۔ علاوہ ازیں سعیدہ افضل، صبیحہ قریشی، شاہدہ عطا مقدس، خالدہ نوشین، پروین عزیز، رفیعہ عباسی، بشریٰ رحمن، عابدہ کلانچوی، ریحانہ یاسمین اور سعیدہ خانم کھوکھر کے نام بھی افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔

افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول نگاری میں بھی خواتین کا حصہ شامل ہے۔ اقبال بانو کا ناول "ساڈول موڑ مہاراں" قسط وار شائع ہونے کے بعد کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس ناول میں پائی جانے والی کہانی میں دیہات کا ماحول اور جاگیرداری نظام کا عکس واضح نظر آتا ہے۔ بشریٰ رحمان کے اردو ناول "لالہ صحرائی" کا سرائیکی ترجمہ سجاد حیدر پرویز نے "زخمے پار ڈاڈھے او کھے پندھ ان" کے عنوان سے کیا۔ جو کہ قسط وار شائع ہونے کے بعد کتابی شکل میں سامنے آ چکا ہے۔ یہ ناول چولستان کی تہذیب و ثقافت کا عکاس ہے۔

ڈراما نگاری کے حوالے سے مسرت کلانچوی کی کتاب "سجھ صباحیں" کی اہمیت کے حوالے سے اصغر ندیم سید لکھتے ہیں کہ سرائیکی علاقے کا مزاج اور ثقافت منفرد ہے۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ مسرت کلانچوی کے ڈرامے پڑھ لے۔ مسرت کلانچوی کے علاوہ صبیحہ قریشی اور شبانہ کریم کے تحریر کردہ ڈرامے بھی رسائل و جرائد کا حصہ بن چکے ہیں۔

روہی سے تعلق رکھنے والی مریم مجوبیہ نے انشائیہ کے میدان میں قدم رکھا اور "اکھ" کے عنوان سے انشائیے کا مجموعہ پیش کیا۔ اکھ، پال، گندے، چتی، جمل، کوڑ، عمل، رزنی، پیر مسئلہ، میڈا اسکول، کتاب، اوے، بجار، جیسے عنوانات کے حوالے سے لکھے گئے انشائیے نثری ادب کے ساتھ ساتھ سرائیکی کے نسائی ادب میں بھی اہم اضافہ ہے۔

زاہدہ اجمل ہاشمی کی کتاب "ادھوریں مجھتیں دی سوجھ" ۲۰۲۰ء میں شائع ہوئی جس میں متعدد نثری اصناف شامل کی گئی ہیں جن میں افسانے، کہانیاں، جگ بیتی، آپ بیتی اور خاکہ نگاری کو خاص طور

پر اہمیت حاصل ہے۔ ۲۰۲۱ء میں زاہدہ اجمل ہاشمی کی دوسری کتاب "رلے پندھ کریہوں" بھی منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں حجاز مقدس کا سفرنامہ، لوک ادب کے حوالے سے رسم و رواج اور اصلاحی و معاشرتی کہانیوں کے علاوہ چند مضامین بھی پیش کیے گئے ہیں، تو گویا یہ دونوں کتب جہاں مختلف اصناف کی نمائندگی کرتی ہیں وہاں صنف نازک کی ادبی خدمات کو بھی اجاگر کرتی نظر آتی ہیں۔

لسانیات جیسے موضوع کی اہم کتاب "سرائیکی محاورے اور ضرب الامثال" سیدہ انجم گیلانی کی خوبصورت کاوش ہے۔ اس کتاب میں شامل سرائیکی محاوروں اور ضرب الامثال کے اردو تراجم شامل ہیں نیز وضاحت کے لیے کہیں کہیں سرائیکی اشعار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ عاصمہ ظہور کی کتاب "سرائیکی اردو و انگریزی بول چال" بھی سرائیکی لسانیات کی نمائندگی کرتی ہے۔

بچوں کا ادب بھی خواتین کا پسندیدہ موضوع ہے۔ "وڈیں دا آزار" کے عنوان سے مسرت کلانچوی کی کہانی اسی موضوع کے پیش نظر سامنے آئی۔ بانو بلوچ نے سرائیکی پہیلیاں "بجھ میڈی بجھارت" کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کیں۔ "گھوٹ کتار دے لیفے"، "مخوری مسکار" اور "ڈاکٹریں دے لیفے" بھی بانو بلوچ نے مرتب کیے جن کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ بانو بلوچ کی سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری بھی اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہے۔

سرائیکی ادب میں فریدیات کا موضوع خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلہ میں عمرانہ نجم کی کتاب "چاہت فرید" لاہور سے شائع ہوئی۔ جمیلہ درانی کی کتاب "خواجہ غلام فرید۔ شخص اور شاعری" جام پور سے چھپی جس میں کلام فرید کا تجزیہ آسان انداز میں پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر روبینہ ترین کی کتاب "خواجہ غلام فرید شخصیت اور شاعری" ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا ایک حصہ ہے جسے سرائیکی ادبی بورڈ ملتان نے شائع کیا۔ سرائیکی ادبی بورڈ کی پیشکش کے طور پر سامنے آنے والی عائزہ قریشی کی مرتب کردہ کتاب "تناظرات فرید" بھی فریدیات کے سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ واصفہ جبیں کی کتاب "تدوین کلام فرید اردو" ان کے ایم فل کا تحقیقی مقالہ ہے جسے کتابی شکل میں پیش کیا گیا۔ اس کتاب میں کلام فرید کی تدوین کے لیے مولانا برخوردار کے قلمی اور خانعراقی نسخے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

تاریخ وثقافت کے ارشمین نقوی کی کتاب "چولستان: تاریخ کے آئینے میں" بہاولپور اور چولستان کی تاریخ کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ "خواجہ غلام فرید اور روہی" کا خصوصی تذکرہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ ڈاکٹر روبینہ ترین کی کتاب "شمس سبزواری: سوانح حیات اور تاریخی پس منظر

''ملتان سے شائع ہوئی۔ جس میں حالات و واقعات کے علاوہ حضرت شاہ شمس کا کلام بھی شامل کیا گیا۔ اسی طرح شبانہ نذر کی تحقیق و تدوین کے حوالے سے ''ملتان: عرب مورخین کی نظر میں'' کے عنوان سے بھی کتاب سامنے آئی۔ خدیجہ کبریٰ کی کتاب ''سرائیکی دھرتی دے قصے'' وسیب کے لوک ادب کی عکاس ہے۔ عاصمہ ظہور کی کتاب ''شادی دے سہرے'' اور قدسیہ قاسم کی کتاب ''سرائیکی لوریاں'' لوک شاعری کی ترجمانی کرتی ہیں۔

شعبہ سرائیکی بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی استاد ڈاکٹر نسیم اختر کی جانب سے احمد غزالی کی کتاب ''چولستانی لوک کہانیاں'' کا سرائیکی ترجمہ اسی عنوان سے پیش کیا گیا۔ قبل ازیں جاوید احسن کی کتاب ''سرائیکی ثقافت'' کا اردو ترجمہ بھی نسیم اختر کی پیش کش کے طور پر سامنے آیا۔ ڈاکٹر نسیم اختر کی تحقیقی اور تنقیدی کتب میں حاجی پور (راجن پور) سے تعلق رکھنے والے شاعر میاں اللہ بخش عارض اور گڑھی اختیار خان (رحیم یار خان) کے معروف شاعر احمد یار فریدی کے منتخب کلام کو ''دیوان عارض مع ڈوہڑہ جات احمد یار فریدی'' کے عنوان سے سامنے لانے کے علاوہ سندھی اور سرائیکی کے اہم کلاسیکی شاعر چل سرمست کی شاعری'' چل سرمست دا سرائیکی کلام'' سرائیکی ادب میں اہم اضافے ہیں۔ چھٹی صدی ہجری کے شاعر قبول فقیر قوالا کی یادگار سرائیکی شاعری ''ذبح نامہ حضرت اسمٰعیل'' کی تدوین بھی انہی کے حصے میں آئی۔ یہ تدوین ڈاکٹر حنیف چودھری کے ملکیتی نسخے کو سامنے رکھ کر کی گئی۔ یہ قلمی نسخہ (ضعیف) نیک محمد کا تحریر کردہ ہے۔ ڈاکٹر نسیم اختر نے ''دیوان ولایت شاہ'' بھی ترتیب دیا۔ اس دیوان میں ۱۰۹ کافیاں، ۱۶۳ ڈوہڑے اور ایک بارہ ماسہ شامل ہے۔ نسیم اختر کی کتاب ''سرائیکی افسانے وچ خواتین دے مسائل'' نے سرائیکی تحقیقی، تنقیدی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

قدسیہ قاسم کی کتاب ''سرائیکی افسانے دا فنی ویروا'' اپنے موضوع کی اہم تحقیقی، تنقیدی کاوش ہے۔ قدسیہ قاسم نے اس موضوع پر ایم اے سرائیکی کا مقالہ تحریر کیا تھا اور جب کتابی شکل میں پیش کیا تو اس میں ضروری ترامیم اور اضافے کرتے ہوئے تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کا حق بھی ادا کیا۔

''محمود عتیق فکری: توضیحی اشاریہ'' شعبہ سرائیکی بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی پیشکش ہے جس کے مرتبین میں شبیر حسن اختر کے علاوہ دو خواتین نجمہ شبیر اور نسیم اختر بھی شامل ہیں۔ لاہور سے شائع ہونے والی کتاب ''طاہر محمود کوریجہ۔ فن اور شخصیت'' مشترکہ تصنیف کے طور پر سامنے آئی جس کے مصنفین میں حمید الفت ملغانی (راقم) کے علاوہ خاتون لکھاری بشریٰ ناہید شامل ہیں۔ اس کتاب کا

CamScanner

ابتدائی حصہ بشریٰ زاہد کے ایم اے اردو کے مقالہ پر مبنی ہے۔

"سرائیکی دانش کے ساتھ مکالمہ" کے عنوان سے ثنائلہ حسین کے انٹرویو کتابی شکل میں سامنے آئے، جس میں سرائیکی زبان، ادب اور وسیب کے بارے میں متعدد موضوعات زیر بحث لائے گئے۔ اس کتاب میں میر حسان الحیدری، اسماعیل احمدانی، محمد اسلم رسول پوری، ڈاکٹر احسن واگھا، حفیظ خان، عاشق بزدار، رشید قیصرانی، رفعت عباس، اشولال اور ڈاکٹر جاوید چانڈیو کے انٹرویو شامل کیے گئے ہیں۔

مسرت کلانچوی کی کتاب "کلی مدنی ﷺ" سیرۃ النبی ﷺ کے سلسلہ کی اہم کڑی ہے۔ جسے اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے خواجہ فرید ایوارڈ کا حق دار ٹھہرایا گیا۔ دینی موضوع کے سلسلہ کی کتاب "خوشبو بھریاں چھانواں" کوثر ثمرین کی تحریر کے طور پر سامنے آئی۔ جس میں امہات المومنین کے حالات زندگی قلمبند کیے گئے ہیں۔

سرائیکی ادب کے فروغ کے سلسلہ میں یونیورسٹی کی سطح کے مقالہ جات بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بہت سے مقالہ جات ایسے ہوتے ہیں جو شائع نہ ہونے کے باعث محض یونیورسٹی کے کتب خانہ میں تحقیقی حوالہ کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ سرائیکی میں ہونے والے ایم اے کی سطح کے ابتدائی مقالہ جات میں روشن سلطانہ کا مقالہ "سرائیکی ناول دا ارتقا" صائمہ رحمن کی تحقیقی کاوش "مولانا حفیظ الرحمن بہاولپوری فن تے شخصیت" ثروت ملک کی تحقیق "بریگیڈیر نذیر علی شاہ، فن تے شخصیت" ثریا جمیل کا مقالہ "صدیق طاہر، فن تے شخصیت" ریحانہ رشید رحمانی کی تحریر "ایم اے عزیز شرر غوری، فن تے شخصیت" ساجدہ بتول علوی کا تحقیقی مقالہ "سرائیکی وچ چھدو وبائیاں" صادقہ سلطانہ کا مقالہ "لغت سرائیکی تے علی حیدر ملتانی" نزہت راجہ کی کاوش "خواجہ فرید تے مولوی لطف علی دے اثرات" اور سعدیہ رشیدہ ملک کا مقالہ "صاحبزادہ ریاض رحمانی شخصیت تے فن" شامل ہیں۔ بعد ازاں مقالہ جات کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے علاوہ بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ پاکستانی زبانیں سے متعدد مقالہ جات سرائیکی نسائی ادب میں اضافہ کا سبب بنتے رہے۔

طنز و مزاح

سرائیکی ادب میں طنز و مزاح کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ سرائیکی شاعر اور ادیب فطری طور پر مزاح کا مزاج رکھتے ہیں۔ مزاحیہ چھلے، ماہیے، ڈھولے، دوہڑے، لوک گیت اور متعدد موضوعات کے حوالے سے مزاحیہ نظمیں لوک شاعری میں شامل ہیں۔ لوک شاعری کے علاوہ لوک نثر میں بھی ضرب الامثال، پہیلیاں، لطائف اور مزاحیہ قصے کہانیوں کے حوالے ملتے ہیں۔

قدیم شعراء کے کلام میں بھی طنز و مزاح کا سلسلہ جاری رہا۔ ان شعراء میں حمل لغاری، دلو رام موجی، نگامن کروڑی، خرم بہاولپوری، یتیم جتوئی اور جانباز جتوئی کے نام خاص طور پر معروف ہیں۔ کتب کی اشاعت کے بعد کئی شعری مجموعوں میں طنز و مزاح کے الگ حصے شامل ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل مجموعے بھی اس موضوع کی نمائندگی کرتے نظر آئے۔ ان کتب کے حوالے سے دیکھا جائے تو جمشید کمتر کے شعری مجموعے "ڈکھڑا ایجے" اور خورشید محمد ملک کی کتاب "تھڈا" میں طنز و مزاح کا رنگ نمایاں ہے۔
جند وڈا معصوم کے دو شعری مجموعے "اکھیاں مسکلا" اور "فقا کے بچا کے" کے علاوہ ملک غلام رسول ڈڈا کا مجموعہ کلام "نچھرے توں آ کریں تیں" اور عبدالخالق سرمد کا مجموعہ "کھدیں کھدیں" اور وزیر جعفری کی مرتب کردہ کتاب "مزاحیہ سرائیکی شاعری" میں سرائیکی کے معروف شعراء کا کلام شامل کیا گیا ہے۔
شعری کتب کے ساتھ ساتھ متعدد شعری کتابچے طنز و مزاح کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان شعراء میں اکرم قریشی، دلنواز پوری، شوکت بھٹی، شفقت بزدار، محمد یار بے رنگ، ہمراز اُچوی، کریم بخش کریمی، شہزادہ آصف، بجنت علی سرور، اصغر چنڑل، وزیر جعفری، شبیر ابن بے رنگ، محمد اقبال عاقل اور دیگر کئی نام شامل ہیں۔

سرائیکی نثر کے حوالے سے دیکھا جائے تو محمد اسلم قریشی کی مرتب کی گئی کتاب "مسکا لیاں" کو پہلی مزاحیہ کتاب کہا جا سکتا ہے جس میں محمد اسلم قریشی کے علاوہ ابن الامام شفتر، قاسم جلال، شفائے اطہر ادریس، پروین کے مزاحیہ مضامین اور کچھ اردو سے سرائیکی تراجم بھی شامل ہیں۔
ابن قیصر کی کتاب "تک تکور" کا شمار بھی طنز و مزاح کی ابتدائی کتب میں ہوتا ہے جس میں

نظمیں، مضامین اور لطیفے شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ابن قیصر کی کتاب "گزری وہانی" کو اکیسویں صدی کے آغاز کی اہم کتاب کہہ سکتے ہیں۔ جس میں دھرتی کے سیاسی حوالے کو مزاح کے رنگ میں پیش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔

دلشاد کلانچوی کی کتاب "نخرہ پیا اوسوچ" میں طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے علاوہ خط اور انشائیے بھی شامل ہیں۔ منظور احمد اعوان کی کتاب "کھلے دھک" اور راہی گبول کی کتاب "بشخو ے تیر" میں سرائیکی وسیب میں پایا جانے والا طنز و مزاح کا روایتی رنگ واضح نظر آتا ہے۔ حاجی رانا سردار احمد سعید کی مزاحیہ کتب "آسوں پاسوں" اور "گل وسیب" میں شامل تحریریں ہمارے معاشرے کے مختلف پہلو اجاگر کرتی ہے جن میں انشائیے کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر محمد عباس کی کتاب "صحرا میں گلاب" جہاں نئے اور منفرد انداز کی تحریروں پر مبنی ہے وہاں اس کتاب کی تحریریں طنز کے نشتر سے بھرپور نظر آتی ہیں جس میں وسیب کے مختلف رنگ شامل ہیں۔ ان رنگوں میں رسم و رواج کے طوق، سیاسی افراتفری، معاشرتی عوامل، دہشت ناک ماحول، فرقہ واریت، تعلیمی مسائل، روہی تھل دمان کے ساتھ ناروا سلوک، روزگار کی مشکلات اور اسلامی دنیا کے مسائل کو طنزیہ انداز کے ڈنگوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی سب سے منفرد بات یہ ہے کہ آمنے سامنے کے صفحات پر ایک ہی بات کو سرائیکی اور اردو میں پیش کیا گیا ہے۔

انیس دین پوری کی مزاحیہ تحریریں مختلف اخبارات میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان تحریروں کو ظہور احمد دھریجہ کی ترتیب و پیش کش سے "بٹ کڑاک" کا عنوان دے کر شائع کیا گیا۔ جس سے سماج میں پائی جانے والی کڑوی سچائیوں کو طنزیہ و مزاحیہ رنگ میں سامنے آنے کا موقع ملا۔

سرائیکی لطائف کے بارے میں احسان اعوان کا مرتب کردہ مجموعہ "ڈنڈ پٹ" کو متعدد بار شائع کیا گیا۔ سجاد حیدر پرویز کا لطیفوں کا انتخاب "کھل اوے کاکا کھل" کے عنوان سے سامنے آیا۔ انو بلوچ کے مرتب کردہ لطائف "بشخوری سنگار"، "گھوٹ گنوار دے لطیفے"، "ڈاکٹریں دے لطیفے" اور "رسیں دے لطیفے" کے عنوانات سے شائع ہو چکے ہیں۔ راہی گبول کے مرتب کردہ لطیفے "کھل دے لشکارے"، "مشکوڑے"، "ولا ڈنڈ پٹ"، "ڈوہ گت" اور "مشکڑیاں" جیسے عنوانات سے سامنے آئے ہیں۔ جب کہ منظور اعوان کا انتخاب "کھلکاڑیاں"، زید جعفری کی مرتب کردہ کتاب "کھل دے لشکارے" اور بشیر دیوانہ کے مرتب کردہ کھلاوڑیں لطیفے" اور "کھل دے ٹھاکے" بھی سرائیکی کے طنزیہ

اقبال اور سرائیکی زبان و ادب

اقبال کا تصور شعر فلسفیانہ افکار کا غماز، شاعرانہ رموز سے شناسا اور مشرقیت کے جذبے سے سرشار ہے۔ کلام اقبال مسلمانان مشرق کے نظام حیات میں رونما ہونے والے خاموش انقلاب کے لیے چراغ رہ گزر کی مثال ثابت ہوا۔ شاعر مشرق نے "خوشحال خان کی وصیت"(۱) کو آشکار کرنے اور آخری ایام میں اپنے ملازم دیوان علی سے خواجہ غلام فرید کی کافیاں سنتے رہنے سے واضح کیا ہے کہ وہ مشرق میں بولی جانے والی زبانوں سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے(۲)۔ دیگر پاکستانی زبانوں کے قلم کاروں کی طرح سرائیکی زبان کے متعدد لکھاری بھی عصر اقبال سے ہی افکار اقبال کے شیدا تھے۔ معاصر اقبال میں سرائیکی زبان کے ایسے دانشور شامل تھے جنہیں اقبال سے ملاقات کے مواقع ملے یا خطوط کے ذریعے سے ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ معروف ماہر لسانیات ڈاکٹر مہر عبدالحق نے زمانہ طالب علمی میں پروفیسر کریم بخش شاکر کی وساطت سے علامہ اقبال سے ملاقات کا شرف حاصل کیا(۳)۔ سرائیکی کے اہم شاعر حسن رضا گردیزی کو بھی دوران تعلیم راجہ عبداللہ نیاز کی معیت میں اقبال سے مل بیٹھنے کا موقع ملا(۴)۔ ملاقاتوں کے حوالے سے عبدالعظیم خان سنکانی کا نام بھی آتا ہے جن کی تحریر کردہ سرائیکی نظم بہ حوالہ اقبال، عہد اقبال میں سامنے آنے والے جذبات و بیان کی آئینہ دار ہے(۵)۔

سرائیکی زبان میں شروع ہونے والا نذرانۂ عقیدت کا سلسلہ موجودہ دور تک جاری ہے اور درجنوں شعراء کے کلام میں سامنے آنے والے خراج تحسین پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو جانباز جتوئی، حسن رضا گردیزی، نشتر غوری، سفیر لاشاری، امید ملتانی، دلشاد کلانچوی، محمد رمضان طالب، قاسم جلال اور محمد اسلم میتلا کے نام نمونے کے طور پر نظر آتے ہیں۔ نثری حوالے سے بھی اقبال کے افکار و نظریات اہل علم و دانش کی توجہ کا مرکز بنے جن کے باعث بیسیوں سیر حاصل مضامین سرائیکی جرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ ماہنامہ "سرائیکی ادب" ملتان میں شامل محمد اسماعیل احمدانی، مولانا نور احمد خان فریدی، ارشد ملتانی، عمر علی خان بلوچ، سجاد حیدر پرویز، تسنیم لیہ اور محمد اسلم میتلا جیسے قلم کاروں کی تحریریں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سہ ماہی "سرائیکی" بہاول پور کے شمارہ جات میں نشتر غوری، انیس پیرزادہ، دلشاد کلانچوی، ظفر

لاشاری اور عبدالباسط بھٹی کے مضامین نمائندگی کا حق ادا کرتے ہیں۔ محمد رمضان طالب، اعجاز ڈیروی، عبدالقدوس ساجد اور غلام محمد نظامی نے ماہنامہ "فرید رنگ" ڈیرہ غازی خان کے لیے تحریریں مہیا کیں۔ کتابی سلسلوں میں "سچار" کراچی اور "سجوا" احمد پور شرقیہ میں بھی مختلف جہتوں سے کیا جانے والا کام سامنے آیا۔

تحقیق و تنقید کے حوالے سے دلشاد کلانچوی کی دو کتب "ساڈا اجنت اقبال" اور "چنگاں بال اقبال" سامنے آئیں۔ "چنگاں بال اقبال" میں حیات اقبال مجموعہ وار پیش کی گئی جبکہ "ساڈا اجنت اقبال" کے ذریعے اقبال کے مکتب فکر کو مربوط انداز میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی کتاب "علامہ اقبال تے سرائیکی زبان و ادب" اقبالیات کے موضوع کا وقیع کام ہے۔ جس میں شامل فکر انگیز مضامین، کلام اقبال کے تراجم، نذرانہ عقیدت اور اشاریہ کے باعث مختلف شعبہ جات اور موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ظہور احمد دھریجہ کی کتاب "علامہ اقبال تے سرائیکی وسیب" کے ذریعے جہاں وسیب کے خدوخال واضح ہوتے ہیں وہاں اقبال سے ملاقاتوں کے سلسلے، خطوط کے تبادلے اور اقبالیات کے موضوع پر کام کرنے والے ادیبوں اور دانشوروں کی عالمانہ آرا کو سامنے لایا گیا ہے نیز خواجہ غلام فرید سے علامہ اقبال کی عقیدت اور سرائیکی وسیب خصوصاً ریاست بہاولپور سے اقبال کے تعلق کی وضاحت اس کتاب کی اہمیت کو دو چند کرتی ہے۔

کلام اقبال کے منظوم تراجم کو سرائیکی ادب میں اقبال شناسی کی واضح دلیل کہا جا سکتا ہے۔ افکار اقبال کی تشریح و تعبیر کے لیے نمائندہ شاعر نسیم لیہ کے قلم سے "بال جبریل" کی منتخب غزلیات، رباعیات اور نظموں کے منظوم سرائیکی تراجم پر مشتمل کتاب شائع ہوئی۔ ۱۹۷۴ء (۹)، میں سامنے آنے والی اس کتاب میں تراجم سے پہلے اقبال کے مکالمہ "مرید ہندی اور پیر رومی" کی تقلید میں "مرید پنجاب اور پیر مشرق" کے عنوان سے نسیم لیہ اور علامہ اقبال کے درمیان مکالمہ شامل کیا گیا جس میں یہ دکھایا گیا کہ پیر مشرق کے کہنے پر مرید پنجاب کو بال جبریل کے سرائیکی ترجمے کی جانب راغب کیا گیا۔ نسیم لیہ نے اپنے ترجمے میں اشعار کے معنوی اور صوری حسن کو برقرار رکھنے کے لیے بال جبریل کے بحر و قافیہ کو ممکنہ حد تک تبدیل کرنے سے گریز کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر کا ترجمہ کچھ یوں کیا گیا۔

اقبال نے کہا۔

؎ ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

اور نسیم لیہ کا ترجمہ ہے

؎ ہوا دے اِن توڑے تیز جھکّو تاں وت وی ڈیوا بلیندا ودے

اوہو قلندر کریم نے بخشے بات جنگلوں ڈتے شہانہ

علامہ اقبال کی فقید المثال کتاب "جاوید نامہ" کا سرائیکی ترجمہ ڈاکٹر مہر عبدالحق کی گراں بہا خدمات میں شامل ہے۔ فارسی سے سرائیکی میں ہونے والے اس منظوم ترجمے کو شائع ہونے سے قبل ریڈیو پاکستان ملتان کی جانب سے تمثیل کی شکل میں ۱۵ اقساط میں نشر کیا گیا ۔ ۱۹۷۷ء ہی میں شائع ہونے والا یہ ترجمہ بھی کلامِ اقبال ہی کی بحر میں کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ متعدد اصطلاحات کو بھی تبدیل نہیں کیا گیا۔ البتہ دسیوں اصطلاحات کی تشریحات کتاب کے آخر میں شامل کی گئی ہیں۔

نواز سیت پوری، خادم ملک ملتانی اور ڈاکٹر ایاز سہروردی کے نام "شکوہ، جوابِ شکوہ" کے مترجمین کے طور پر لیے جاتے ہیں۔ جن میں سے ڈاکٹر ایاز سہروردی کا منظوم سرائیکی ترجمہ "روح ربانی" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ جبکہ نواز سیت پوری کا قلمی ترجمہ اور خادم ملک ملتانی کا کیسٹ کیا گیا منظوم ترجمہ موجود ہے۔ غیر مطبوعہ ترجمے کے حوالے سے نشتر غوری کا نام بھی آتا ہے۔ جنھوں نے "رموزِ بے خودی" کا سرائیکی ترجمہ کیا ہے(۷)۔ اسی طرح علامہ غلام حسین ذاکر کے کیے گئے "اسرارِ خودی" کے ترجمے کا بھی پتہ چلا ہے جو قلمی نسخہ کے طور پر موجود ہے(۸) متفرق تراجم کے حوالے سے حافظ سعید قریشی کے ترجمہ شدہ "علامہ اقبال دے ڈو خط" کو سہ ماہی "سرائیکی" بہاول پور میں شائع کیا گیا(۹)۔ امید ملتانی نے علامہ اقبال کی متعدد نظموں کا منظوم سرائیکی ترجمہ پیش کیا جن میں عقل و دل، پرندے کی فریاد، رات اور شاعر، بلال، چاند اور ہمالیہ جیسی نظمیں قابلِ ذکر ہیں(۱۰) اکرم رونگھا، ڈاکٹر ایاز سہروردی اور اصغر عابد کے کیے گئے منظوم تراجم کے لیے علامہ اقبال کی متعدد نظموں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جس سے سرائیکی ادب اور اقبالیات کے گہرے تعلق کا پتا چلتا ہے۔

تراجم کے علاوہ متعدد سرائیکی شعراء کے کلام میں شعوری اور لاشعوری طور پر علامہ اقبال کی تقلید کا پہلو واضح نظر آتا ہے۔ "تعمیرِ خودی" کے عنوان سے نسیم لیہ کی اردو نظم کی ضخیم کتاب تقلیدِ اقبال کی اہم مثال ہے جو کہ تا حال غیر مطبوعہ ہے(۱۱)۔ عوامی شاعر شاکر شجاع آبادی نے علامہ اقبال سے متاثر ہو کر متعدد اشعار تحریر کیے ہیں جیسے شاکر نے "شکوہ جوابِ شکوہ" کو اپنے انداز میں کچھ یوں پیش کیا ہے۔

شکوہ:

میڈی سوچ تے پانی پھیر ڳن ڈتو کھیڈ واجا میڈا کیا رہ گئے
میڈا امن سکون آرام خوشی کیتو فون سوا میڈا کیا رہ گئے
کر ختم جوانی شاکر دی ، ڈتو کر نوا میڈا کیا رہ گئے
میڈے شکوے تے اجار نہ کر چلو آپ ڈسا میڈا کیا رہ گئے

جواب شکوہ:

میڈا روون کوڑ دا رووݨ ہے اجاں رووݨ جوگا حال تو ہئی
میڈے زور اتی تیکوں یار ڈتم ڈٹھا درداں دا گڑدھال تو ہئی
جیکوں جو ڈیواں ڈے وار تاں ٹی میڈی قدرت دا خیال تو ہئی
میڈا شکوہ ہوش سنبھال تے کر توں شاکر ہیں اقبال تو ہئی

اقبال اور سرائیکی ادب کا ایک اہم حوالہ علامہ اقبال کی خواجہ غلام فرید سے عقیدت بھی ہے۔ خواجہ فرید کے صوفیانہ افکار اور تخلیقی شعور سے شناسائی کے باعث علامہ اقبال نے انھیں عالمگیر حیثیت کا حامل قرار دیتے ہوئے کہا۔

"افسوس کہ خواجہ صاحب کی شاعری ایک
خاص علاقے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ان کا کلام ایک
گہرے مطالعہ کا محتاج ہے۔ مجھے تو اس میں بین الا
قوامی حیثیت واہمیت کے عناصر نظر آتے ہیں۔"[11]

کلام فرید اور کلام اقبال کا تجزیہ کیا جائے تو متعدد مقامات پر اشتراک کے عناصر عیاں ہیں۔
مثال کے طور پر

فرید:

کیکوں حال سناواں دل دا
کوئی محرم راز نہ ملدا

اقبال:

اقبال محرم اپنا کوئی نہیں جہاں میں

معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

فرید:

ایہا ریت سکھی ہئی کہیں دے کوں؟
ڈھولا لُک چھپ بہندیں میں دے کوں

اقبال:

تجھ کو دزدیدہ نگاہی یہ سکھا دی کس نے؟
رمز آغاز محبت کی بتا دی کس نے؟

حوالہ جات

۱۔ علامہ اقبال کی کتاب "بال جبریل" میں "خوشحال خان کی وصیت" کے عنوان سے ایک نظم شامل کی گئی ہے۔

۲۔ ہاشم شیر خان، علامہ اقبال اور ڈیرہ غازی خان، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۱ء، ص ۷۷

۳۔ عبدالحق، ڈاکٹر، علامہ اقبال کی خدمت میں، مشمولہ "مجالس اقبال" مرتب: جعفر بلوچ، لاہور: دارالکتب، ۲۰۰۲ء، ص ۲۵۸

۴۔ حسین رضا گردیزی، سید، جناب نیاز علامہ اقبال کی بارگاہ میں، مشمولہ "مجالس اقبال" مرتب: جعفر بلوچ، ص ۱۰۹

۵۔ ہاشم شیر خان، علامہ اقبال اور ڈیرہ غازی خان، ص ۲۹

۶۔ سجاد حیدر پرویز، ڈاکٹر، مختصر تاریخ زبان و ادب سرائیکی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء، ص ۳۹۵

۷۔ نسیم لیہ، بال جبریل، منظوم سرائیکی ترجمہ، لیہ: بزم سرائیکی تھل، ص ۸

۸۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، علامہ اقبال تے سرائیکی زبان و ادب، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۰۳ء، ص ۲۲

۹۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، علامہ اقبال تے سرائیکی زبان و ادب، ص ۲۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۲

۱۱۔ نسیم لیہ، بال جبریل، منظوم سرائیکی ترجمہ، ص ۸

۱۲۔ ہاشم شیر خان، علامہ اقبال اور ڈیرہ غازی خان، ص ۸۵

CamScanner

ترجمہ کاری

ترجمہ کو عام طور پر دو زبانوں کے درمیان پل کا کردار کہا جا سکتا ہے جس کے باعث زبانیں خیالات و تصورات کو تبادلہ کرتی رہتی ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترجمہ کسی تحریر کا نعم البدل نہیں ہو سکتا بلکہ ترجمانی کا کردار ادا کرتا ہے۔

مرزا حامد بیگ ترجمہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کسی تحریر، تصنیف یا تالیف کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلا تا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ترجمہ کسی متن کو دوسری زبان میں منتقل کرتے ہو ئے اس کی تعبیر کرتا ہے یعنی ترجمے کا عمل ایک علمی یا ادبی پیکر کو دوسرے پیکر میں ڈھالنے کا عمل'' ہے۔(۱)

سرائیکی حوالے سے ترجمہ کاری پر نظر دوڑائی جائے تو اس کی تفصیل کچھ یوں دی جا سکتی ہے:

۱) سرائیکی میں ہونے والے تراجم

۲) سرائیکی سے ہونے والے تراجم

سرائیکی میں ہونے والے تراجم

سرائیکی میں ہونے والے نثری تراجم پر نظر دوڑائی جائے تو میر امن کی داستان ''باغ و بہار'' کے سرائیکی تراجم کو اولیت حاصل ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی شائع کردہ اردو نثری داستان میر امن کی ''باغ و بہار'' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی نمایاں خوبی سادہ اور عام بول چال کی زبان ہے۔ اس داستان کی اہمیت کے پیش نظر سرائیکی میں اس کے منظوم و منثور تراجم سامنے آ چکے ہیں۔ قاضی امام بخش شیروی نے میر امن دہلوی کے اس قصے کا منظوم ترجمہ ''باغ و بہار ملتانی'' کے عنوان سے کیا جو ۱۳۰۰ھ کو مکمل ہوا اور ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) کو شائع ہو کر سامنے آیا(۲)۔ بعد ازاں نثری ترجمے کے حوالے سے محمد نعیم اریجا کا نام آتا ہے جنہوں نے ۱۹۹۳ء میں ''باغ و بہار'' کا ترجمہ شروع کیا جس کی محض ایک قسط ماہی''

سرائیکی "بہاول پور" میں چھپنے کے بعد کام بند ہو گیا(۵)۔ میر امن کی اس داستان کا سرائیکی میں مکمل ترجمہ "قصے تے پندھ" دلشاد کلانچوی نے کیا جسے سرائیکی ادبی مجلس بہاول پور نے ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔

کلاسیکی اردو ناول کی ترجمہ کاری کے سلسلے میں ۱۹۷۷ء میں دلشاد کلانچوی نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "توبۃ النصوح" کو "توبہ زاری" کے عنوان سے سرائیکی روپ دیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے یہ ناول کب لکھا اس میں اختلاف ہونے کے باوجود ۱۸۷۷ء کی روایات بھی سامنے آتی ہیں(۲) جس کے باعث کہا جا سکتا ہے کہ "توبہ زاری" کے عنوان سے کیا جانے والا سرائیکی ترجمہ اصل ناول کو سو سال مکمل ہونے کی ایک یادگار ہے۔ مرتضیٰ نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "توبۃ النصوح" کی سرائیکی زبان میں ریڈیائی تشکیل کی جسے سات اقساط میں ریڈیو پاکستان ملتان سے ۱۹۸۰ء کے وسط میں نشر کیا گیا۔ یہ مسودہ ریڈیو پاکستان ملتان کی لائبریری ریکارڈ کے علاوہ ترجمہ کار کے پاس بھی موجود ہے(۳)

اردو سے سرائیکی میں ترجمہ کیا جانے والا دوسرا کلاسیکی ناول "فردوسِ بریں" ہے۔ عبدالحلیم شرر کے اس ناول کو نذیر علی شاہ نے "فردوس تھگالی" کے عنوان سے سرائیکی روپ دیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں شائع ہونے والے ناول "فردوسِ بریں" کا سرائیکی ترجمہ ۱۹۷۹ء میں سامنے آیا۔

ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز نے بشریٰ رحمان کے ناول "لالہ صحرائی" کا سرائیکی ترجمہ "ڈٹھے یار ڈاڈھے جھے اوکھے پینڈے ہن" کے عنوان سے کیا۔ یہ ترجمہ دسمبر ۱۹۹۴ء تا مارچ ۱۹۹۵ء ماہنامہ "سرائیکی ادب" ملتان میں قسط وار شائع ہونے کے بعد ۲۰۱۵ء میں کتابی شکل میں سامنے آ چکا ہے جس میں روہی کی تہذیب و ثقافت خاص طور پر نمایاں ہے۔

سرائیکی زبان میں متعدد اصناف کے تراجم ہو چکے ہیں۔ نثری اصناف میں افسانہ کے تراجم کی روایت کسی حد تک مضبوط ہے۔ اردو اور سرائیکی کے مترجمین دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہوئے یہ ترجمے آسانی سے کر لیتے ہیں۔ فرحت نواز نے کرشن چندر اور رشید احمد کے ۲۲ منتخب اردو افسانوں کا سرائیکی ترجمہ "متراں تے پندھ جیڑے" کے عنوان سے ۱۹۸۰ء میں پیش کیا۔ انجینئر مدثر احمد نے پشاور کی خاتون افسانہ نگار منور رؤف کے مجموعے "لمحۂ تماشا" کے آٹھ چیدہ افسانوں کا سرائیکی ترجمہ "ریت گریت" کے عنوان سے ۱۹۹۲ء میں ڈیرہ غازی خان سے شائع کرایا۔ اصغر عابد نے اردو کے معروف افسانہ نگار حمید شاہد کے منتخب افسانوں کو سرائیکی روپ دے کر ۱۹۹۹ء میں "پارہ" کے عنوان سے کتابی شکل دی۔ سجاد حیدر پرویز کے افسانوی مجموعے "سوچاں دے ویہڑے" میں طبع زاد افسانوں کے ساتھ ساتھ چار تراجم بھی

شامل ہیں۔ اردو افسانوں کے سرائیکی تراجم کی اشاعت کے سلسلے میں رسائل و جرائد نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ جن میں ہفت روزہ "اختر" ملتان، ماہنامہ "سرائیکی ادب" ملتان اور سہ ماہی "سرائیکی" بہاول پور کے علاوہ روزنامہ "جھوک" ملتان اور روزنامہ "سجاک" ملتان نے خصوصی کردار ادا کیا۔

جہاں تک سرائیکی میں ترجمہ ہونے والے ڈراموں کا تعلق ہے تو اردو کے کلاسیکی ڈراموں کے تراجم تخلیقی ڈراموں سے پہلے کتابی شکل میں سامنے آئے۔ دلشاد کلانچوی نے امتیاز علی تاج کے ڈرامے "انارکلی" اور شیکسپیئر کے ڈرامے "میکبتھ" کے تلخیص شدہ تراجم کو "انارکلی تے اقتدار دی ہوس" کے عنوان سے ۱۹۷۸ء میں شائع کرایا یعنی اردو اور انگریزی کے دو اہم سٹیج ڈراموں کو یکجا کر کے سرائیکی روپ میں پیش کیا۔ ۱۹۸۱ء میں سرائیکی ادبی مجلس بہاول پور نے اردو کے مایہ ناز ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری کے تین ڈراموں کے سرائیکی تراجم کرائے۔ دلشاد کلانچوی نے ڈراما "خوبصورت بلا" کو "سچ ڈکھاں دی سچ سکھاں دی" کا عنوان دیا۔ فدائے اطہر نے حشر کاشمیری کے ڈرامے "خوابِ ہستی" کو "کوڑا خواب" کے عنوان سے سرائیکی جامہ پہنایا اور محمد اسلم قریشی نے ڈراما "رستم و سہراب" کا ترجمہ کر کے "رستم تے سہراب" کا عنوان دیا۔ ممتاز مفتی کے تین ایکٹ کے اردو ڈرامے "لوک ریت" کا سرائیکی ترجمہ حمید الفت ملغانی (راقم) نے "مگل گالھ واں ریت دا" کے عنوان سے ۱۹۹۲ء میں کتابی شکل میں پیش کیا۔

اردو کے تخلیقی ادب کے علاوہ نثری تراجم کی بات کی جائے تو شبلی نعمانی کی معروف کتاب "سیرۃ النبیؐ" میں سے "اخلاقِ نبویؐ" کے منتخب حصے کو فدائے اطہر نے ۱۹۸۲ء میں سرائیکی قالب میں ڈھال کر "سوہنے دا خلق" کے عنوان سے کتابی شکل دی۔ علاوہ ازیں سیرت طیبہ کی نسبت سے حضرت احمد سعید دہلوی کی کتاب "معجزاتِ رسولؐ" کو دلشاد کلانچوی نے سرائیکی ترجمے کے طور پر "رسول کریمؐ دے معجزے" کے عنوان سے ۱۹۸۲ء میں بہاول پور سے شائع کرایا۔

ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز نے جو تراجم کیے ان میں واصف علی واصف کی کتب "کرن کرن سورج" اور "بات سے بات" خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ جن کے تراجم بالترتیب "کرناں کرناں سجھ" اور "گالھ توں گالھ" کے عنوانات کے طور پر ۲۰۰۰ء اور ۲۰۱۵ء میں شائع ہو کر سامنے آئے۔ ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کے اردو سے سرائیکی تراجم میں رسالہ "الانسان" کراچی کے مضمون "رسم جہیز" کا ترجمہ "ڈاج" کے عنوان سے ۱۹۸۹ء میں سامنے آیا (۲)۔ ۱۹۹۳ء میں عبدالجبار اثر کی اردو کتاب "وادی مہران کی سیر" کو سجاد حیدر پرویز نے "سندھ دی وادی" کے عنوان سے سرائیکی زبان میں ترجمے کے طور پر پیش کیا اور ۱۹۹۹ء

میں شگفتہ ہاشمی کے کتابچے "خدمتِ خلق" کے منتخب حصوں کا ہونے والا سرائیکی ترجمہ "خلقت دی داری" بھی سجاد حیدر پرویز کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

پروفیسر شوکت مغل نے ڈاکٹر سلیم اختر کی اردو تنقید کے موضوع پر سامنے آنے والی کتاب "تنقیدی داستان" کو سرائیکی پڑھنے والوں کے لئے اسی عنوان کے تحت ۱۹۹۸ء میں کتابی شکل میں پیش کیا۔ یہ کتاب تحقیق و تنقید کے حوالے سے کام کرنے والوں کے لیے خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔

احمد غزالی کی کتاب "چولستانی لوک کہانیاں" کا سرائیکی ترجمہ شعبہ سرائیکی بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی استاد نسیم اختر نے اسی عنوان سے پیش کیا۔ اس کتاب کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں پیش کی جانے والی سرائیکی کہانیوں کو سرائیکی میں ترجمہ کیا گیا تو ان کہانیوں کو اصلی روپ مل گیا۔

سرائیکی کے معروف نثر نگار عبدالباسط بھٹی نے رانا محبوب اختر کے اردو کالم "لوک بیانیہ" کو "اجوکی گالھ" کے عنوان سے سرائیکی قالب میں ڈھال دیا۔ علاوہ ازیں پٹھوار کے باسی اسد محمود خان کے اردو قصے کہانیوں پر مبنی سرائیکی ترجمہ بہ عنوان "وریٹک" بھی عبدالباسط بھٹی کے ترجمے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۲۰۱۸ء میں اردو میں سامنے آنے والی رانا محبوب اختر کی کتاب "مونجھ سے مزاحمت تک" کو ۲۰۲۰ء میں عاشق بزدار نے سرائیکی قالب میں ڈھالنے کا حق ادا کیا۔ اس کتاب میں سرائیکی زبان کے معروف شعرا احمد خان طارق، اقبال سوکڑی، اسلم جاوید، اصغر گورمانی، صوفی تاج گوپانگ، جہانگیر مخلص، سعید اختر سیال، شاکر شجاع آبادی، قیصر عارف قریشی، عاشق بزدار، عزیز شاہد اور رفعت عباس کے علاوہ موسیقی کی دنیا کی اہم شخصیت ثریا ملتانیکر کے بارے میں تجزیاتی مطالعہ شامل ہے۔

اردو کی نثری تحریروں سے کیے گئے سرائیکی تراجم کے ساتھ ساتھ شعری تخلیقات کے سرائیکی میں کیے جانے والے شعری تراجم کو دیکھا جائے تو کلاسیکی شاعری میں سے میر حسن کی معروف مثنوی "سحر البیان" کو ۱۹۸۳ء میں دلشاد کلانچوی نے منظوم ترجمہ کرتے ہوئے "دل بہار" کا عنوان دیا۔ دلشاد کلانچوی کی ۱۹۷۹ء میں ترجمہ کردہ کتاب "غالب دیاں غزلاں" بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ علامہ اقبال کی کتاب "بالِ جبریل" میں شامل منتخب غزلیات کو نسیم لیہ نے ۱۹۷۲ء میں سرائیکی روپ دیا۔ ایاز سہروردی نے "شکوہ جواب شکوہ" کا ترجمہ "روح رہان" ۱۹۹۱ء میں پیش کیا۔ اس کے علاوہ فیض، فراز اور خیام کے کلام کا منظوم ترجمہ "ڈھیر برساتاں دے بعد" بھی ایاز سہروردی کے قلم کا اعجاز ہے۔ فرحت نواز نے وزیر آغا کی

۳۰ نظموں کا منظوم سرائیکی ترجمہ "چوڑ دیاں نظماں" کے عنوان سے کیا جو ۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آیا۔

اردو کے علاوہ عالمی زبانوں کے سرائیکی تراجم بھی سامنے آتے رہے ہیں۔ اس حوالے سے سر ولیم ولسن ہنٹر کی لغت کا اردو ترجمہ شبیر حسن اختر نے "ہندوستان اور بالائی ایشیا کی غیر آریائی زبانوں کی تقابلی لغت" کے عنوان سے کیا۔ شاعری کے سلسلے میں صوفی تاج محمد گوپانگ کی کتاب "صدیں بج الایا" عالمی زبانوں کے شعری ادب کا منظوم سرائیکی ترجمہ ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں میں دو ڈراموں "مرچنٹ آف وینس" اور "کنگ لیئر" کو اقبال نسیم صحرائی نے الگ الگ کتب "وینس دا تاجر" اور "بھولا بادشاہ" کے عنوانات سے سرائیکی روپ دیا۔ عبداللہ عرفان کی کتاب "گالھیں دی پوتھی" چینی زبان کی منتخب کہانیوں کا سرائیکی ترجمہ ہے۔ سعید اختر کی کتاب "رنگولی" منتخب عالمی افسانوں کے سرائیکی تراجم کی عمدہ مثال ہے۔ پاؤلو کوئیلو کے ناول "الکیمسٹ" کو عبدالباسط بھٹی نے سرائیکی قالب میں ڈھال دیا۔ عبداللہ ابن المقفع کے عربی میں حکمت بھرے دلچسپ قصے کہانیوں پر مبنی کتاب "کلیلہ و دمنہ" کا سرائیکی ترجمہ بشیر احمد بھایہ نے "کنگ دانش دے سیخپ" کے طور پر کیا جسے سرائیکی ایریا اسٹڈی سنٹر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے پراجیکٹ کے طور پر ڈاکٹر سید علمدار حسین بخاری کی نگرانی میں مکمل کیا جسے ۲۰۱۹ء میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ جارج آرویل کے انگریزی ناول "1984" کا سرائیکی ترجمہ جاوید آصف نے "اُنوی ۱۰۰ چوراسی" کے عنوان سے ۲۰۲۲ء میں پیش کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالمی ادب کے سرائیکی تراجم لمحۂ موجود تک جاری و ساری ہیں۔

سرائیکی سے ہونے والے تراجم

سرائیکی سے ہونے والے تراجم کو دیکھا جائے تو سرائیکی شاعری سے کیے گئے منظوم و منثور تراجم میں فریدیات کا حوالہ سب سے زیادہ ہے۔ ان تراجم میں مولوی عزیز الرحمان، مولانا نور احمد خان فریدی، صدیق طاہر، خواجہ طاہر محمود کوریجہ اور مجاہد جتوئی کے مرتب کردہ ردیف وار دواوین کے علاوہ ڈاکٹر مہر عبدالحق کا موضوع وار "پیام فرید" اس لیے اہمیت کا حامل ہیں کہ ان میں شامل منثور اردو تراجم خواجہ غلام فرید کی فکر کی تفہیم کرتے ہیں۔ کیفی جام پوری اور ریاض انور کا مرتبہ "کلام فرید" ۱۵۹ کافیوں اور ان کے تراجم کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ شوکت مغل کی کتاب "تفہیم فرید" میں ابتدائی ساٹھ کافیوں کی شرح پیش کی گئی ہے۔

۱۹۹۱ء میں محمد کریم تونسوی، ارشد ملتانی اور ریاض انور کی مرتب کردہ کتاب "پریت بہار" میں خواجہ فرید کے بارے میں لکھے گئے مضامین اور منظوم اردو تراجم پیش کیے گئے۔ کشفی ملتانی نے ۱۹۹۲ء میں "نقشِ صحرا" کے عنوان سے خواجہ فرید کی ۷۰ کافیوں کا منظوم ترجمہ پیش کیا اور تقریباً اتنی ہی کافیاں نور الزمان احمد اوج کے منظوم ترجمے کے طور پر ۱۹۸۰ء میں "روہی رنگ" کے عنوان سے کتابی شکل میں شامل کی گئیں۔ امداد نظامی نے منتخب کافیوں کا منظوم اردو ترجمہ "فرید رنگ فرید انگ" کے عنوان سے ۲۰۰۳ء میں پیش کیا جسے ادبی دنیا میں خوب سراہا گیا۔ امداد نظامی کے کیے گئے منظوم اردو ترجمے میں سے نمونے کا ایک بند ہے:

ہے وحدت کی ہر بات حسیں
یہی ذوقِ طلب کا حسن یقیں
کثرت میں کوئی بھی حسن نہیں

دل غیر سے غیرت کھائے ری
سکھی الف بیدل برمائے ری (۷)

ڈاکٹر طاہر تونسوی کی ترتیب و تہذیب سے سامنے آنے والی کتاب "خوشدل" لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد سے ۱۹۹۳ء میں منظرِ عام پر آئی۔ سرائیکی شاعر خوشدل کے دوہڑہ جات پر مبنی کلام کا منظوم اردو ترجمہ امداد نظامی نے خوب صورتی سے کیا ہے۔

کلاسیکی شاعری میں سے مولوی لطف علی کی مثنوی "سیفل نامہ" کو بشیر احمد ظامی بہاولپوری نے ۱۹۹۳ء میں نثری ترجمے کے ساتھ "سیف الملوک" کے عنوان سے پیش کیا۔ اسی طرح مولوی عبد الکریم اُچوی کی مثنوی "یوسف زلیخا" کو ۱۹۸۷ء میں دلشاد کلانچوی نے نثری اردو ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ مرتب بھی کیا اور فدا نے اطہر نے نور الدین مسکین کی مثنوی "ہیر رانجھا" کا منظوم ترجمہ کرنے کے بعد ۱۹۹۱ء میں "ہیر رانجھا" کے عنوان سے ہی پیش کیا۔ حکومتِ پاکستان کی جانب سے "نیایانِ پاک" اور "وحدتِ افکار" کے عنوانات سے پاکستانی زبانوں کے کلاسیکی شعرا کے کلام سے منظوم تراجم پیش کیے گئے جن میں سرائیکی کے قدیم شعراء کے کلام کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی سرائیکی شاعری کے متعدد نثری و شعری تراجم مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے ہیں۔

سرائیکی سے انگریزی میں ہونے والے ترجمے کو دیکھا جائے تو رحیم طلب کی سرائیکی نظموں کا انگریزی ترجمہ سلطان یاد نے کیا جسے "From The Satluj Bank" کے عنوان سے کتابی شکل دی

گئی۔

سرائیکی نثری اصناف کے اردو تراجم پر نظر دوڑائی جائے تو نثری تخلیقات کے سلسلے میں اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے پاکستانی زبانوں کے اولین ناول کے اردو تراجم کا سلسلہ شروع کیا۔ ظفر لاشاری کے اولین سرائیکی ناول "نازو" کا ترجمہ حمید الفت ملغانی (راقم) نے کیا جو "نازو" ہی کے عنوان سے ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا۔ امداد طارق کی ترتیب و انتخاب سے سرائیکی زبان کے نامور افسانہ نگاروں کے افسانوں کا اردو روپ "سرائیکی کے شاہکار افسانے" کے عنوان سے سامنے آیا۔ ۲۰۰۱ء میں سامنے آنے والی اس کتاب میں شامل منتخب افسانوں کو سرائیکی کے قلم کاروں نے اردو قالب میں ڈھالنے کا فریضہ ادا کیا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے ناول "بیڑی وچ دریا" کا اردو ترجمہ پروفیسر عطا اللہ اعوان نے "کشتی میں دریا" کے عنوان سے کیا جسے ماہنامہ "سپوتنک" لاہور کی دسمبر ۲۰۰۵ء کی اشاعت میں شائع کیا گیا۔ حفیظ خان کے منتخب سرائیکی افسانوں کو شمیم عارف نے اردو ترجمہ کرنے کے بعد "حفیظ خان کی کہانیاں: وادی سندھ کی عورت کا مقدمہ" کے عنوان سے پیش کیا۔ اس کتاب میں ایک درجن کہانیوں کے تراجم کے علاوہ ان کہانیوں کا تفصیلی جائزہ بھی شامل کیا گیا۔ شوکت مغل کی کتاب "تحریرات" میں دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ سرائیکی سے اردو میں ترجمہ کیے گئے آٹھ افسانے بھی شامل کیے گئے ہیں۔

اکادمی ادبیات پاکستان نے حال ہی میں پاکستانی زبانوں کے منتخب افسانوں کے اردو تراجم شائع کرائے۔ اس سلسلے میں سلیم شہزاد کے انتخاب اور ترجمے کے طور پر "منتخب سرائیکی افسانے" بھی کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ جس میں تیس سے زائد سرائیکی افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا ترجمہ اور افسانہ نگاروں کے مختصر کوائف شامل ہیں۔

۲۰۲۲ء میں رفعت عباس کے ناول "لون دا جیون گھر" کا اردو ترجمہ منور آکاش نے "نمک کا جیون گھر" کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کیا۔

اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد سے شائع ہونے والے سہ ماہی "ادبیات" کے مختلف شماروں میں سرائیکی افسانوں کے اردو تراجم سامنے آتے رہے ہیں۔ ماہنامہ "ماہِ نو" لاہور میں بھی سرائیکی افسانوں کے اردو تراجم دیکھنے میں آئے۔ علاوہ ازیں دیگر اخبارات و رسائل میں بھی سرائیکی افسانوی ادب کی مختلف اصناف کے تراجم کا سلسلہ چلتا رہا ہے۔

تخلیقات کے علاوہ لوک ادب، لسانیات اور تاریخ و ثقافت کی متعدد کتب کے تراجم بھی سامنے

آ چکے ہیں۔ لوک ادب کے حوالے سے بشیر احمد ظامی بہاول پوری کی مرتب و ترجمہ شدہ کتاب "سرائیکی لوک کہانیاں" ۱۹۸۳ء میں منظر عام پر آئی نیز شعبہ سرائیکی اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی استاد قدسیہ قسیم کی کتاب "سرائیکی لوریاں" ۲۰۰۹ء میں سامنے آئی۔ جس میں انتخاب کے ساتھ ساتھ تراجم بھی شامل ہیں۔ تین جلدوں پر مشتمل "سرائیکی اکھان" میں شوکت مغل کی ترتیب و تہذیب سے پندرہ ہزار سے زائد ضرب الامثال شامل کی گئی ہیں جن کی متبادل اردو ضرب الامثال بھی ترجمے کے طور پر دی گئی ہیں۔

لسانیات کے سلسلے میں متعدد قاعدے اور لغت کی کتب بھی سرائیکی سے اردو تراجم کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جبکہ تاریخ و ثقافت کے حوالے سے جاوید احسن خان کی کتاب "سرائیکی ثقافت" کو نسیم اختر نے ۲۰۰۶ء میں "سرائیکی ثقافت" ہی کے عنوان سے اردو ترجمے کے طور پر پیش کیا۔ جسے اس موضوع کی نمائندہ کتاب کہا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ ادبی تراجم میں زیادہ تر کو اس لیے اہم سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک زبان کا متن دوسری زبان کے متبادل متن کے طور پر اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی گئی کہ مصنف کے خیالات اس زبان کے الفاظ و محاورات کے سانچے میں ڈھلتے چلے گئے لیکن یہ مسائل بھی پیش نظر رہتے ہیں کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس میں اصل متن کی تمام خوبیاں آ ہی نہیں سکتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مترجم کی طرز ادا اور اسلوب تحریر سے ترجمانی کا حق ادا کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حامد بیگ، مرزا، ترجمے کا فن اور روایت، [illegible]، مطبوعات پاکستان، مئی ۱۹۸۹ء، ص ۴۲

۲۔ انتظار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد دہلوی: احوال و آثار، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء، ص ۳۴۷

۳۔ سجاد حیدر پرویز، پروفیسر ڈاکٹر، اردو اور سرائیکی کے باہمی تراجم، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۱۱ء، بار دوم، ص ۳۱

۴۔ سجاد حیدر پرویز، پروفیسر ڈاکٹر، اردو اور سرائیکی کے باہمی تراجم، ص ۱۳۰

۵۔ دلشاد کلانچوی، سرائیکی اور اس کی نثر، بہاول پور: مکتبہ سرائیکی لائبریری، ۱۹۸۹ء، بار دوم، ص ۸۰

۶۔ سجاد حیدر پرویز، پروفیسر ڈاکٹر، اردو اور سرائیکی کے باہمی تراجم، ص ۱۳۷

۷۔ [illegible]، ۲۰۰۳ء، ص ۲۳۵

کتابیات

☆ ارشاد تونسوی، "عشق اساڈا دین"، ملتان کنڈ (ڈیرہ غازی خان): سجاک ادبی سنگت، ۲۰۱۷ء۔

☆ اسلم عزیز درانی، ڈاکٹر، سرائیکی ناول نگاری، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۰۹ء۔

☆ "تاریخ ریاست ہائے مسلمانان پاکستان و ہند"، چودھویں جلد، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء۔

☆ جاوید اختر بھٹی و دیگر (مرتبین)، "نیا سرائیکی مکالمہ"، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۲ء۔

☆ جاوید چانڈیو، "ارمغان خواجہ فرید"، ملتان: بزم ثقافت، ۲۰۰۸ء۔

☆ جاوید چانڈیو، ڈاکٹر، سرائیکی زبان، ادب اور معاشرہ، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۶ء۔

☆ جسارت خیالی، "سرائیکی اہل قلم کی تخلیقی، تنقیدی اور شعری خدمات"، ملتان: جھوک پبلشرز، ۲۰۲۰ء۔

☆ حفیظ خان، "ادھ ادھورے لوک"، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۸ء۔

☆ حفیظ خان، "[illegible]"، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۳ء۔

☆ حفیظ خان، "رفعت عباس کی سرائیکی شاعری"، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۰۹ء۔

☆ حفیظ خان، "سرائیکی ادب: مشاہدات و جہات"، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۰۹ء۔

☆ حفیظ خان، "سندھ وادی کی شعوری تاریخ کا قاری"، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۳ء۔

☆ حفیظ خان، "تاریخ ملتان"، جلد اول، ملتان: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۱ء۔

☆ حمید الفت ملغانی، ڈاکٹر، "ادب کہانی: ۱۹۹۳ء تا ۲۰۱۶ء"، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۲۰ء۔

☆ حمید الفت ملغانی، ڈاکٹر، "سرائیکی افسانوی ادب"، کراچی: رنگ ادب پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء۔

☆ حمید الفت ملغانی، "کتابیات سرائیکی ادب"، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۱۳ء۔

CamScanner

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

CamScanner